مونوگراف

ملا رموزی

محمد نعمان خاں

مونوگراف

ملا رموزی

محمد نعمان خاں

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9 انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2016
تعداد : 550
قیمت : -/80روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1873

Mulla Ramuzi

By: Mohammad Nauman Khan

ISBN :978-93-5160-105-0

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی110025، فون نمبر:49539000، فیکس:49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر:26109746
فیکس:26108159ای۔میل:ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل:urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی۔110006
اس کتاب کی چھپائی میں70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

ہمارا دور بھی عجیب ہے ایک طرف جہاں اردو زبان کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے تو دوسری جانب دوریاں نزدیکیوں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔ جدید تکنیکی انقلاب نے معلومات کے سمندر کو کوزے میں سمیٹ کر ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے ایسے میں اس خوف کا دامنگیر ہونا خلاف واقعہ نہیں کہ ہمارا قدیم وکلاسیکی ادب اس تکنیکی طلاطم کا شکار نہ ہو جائے۔

اپنے نابغہ ادیبوں وشاعروں پر مونوگراف لکھوانے کے اس نئے سلسلے کا آغاز اسی لیے کیا گیا ہے تاکہ ہم نئی نسل کے سامنے کم سے کم صفحات میں معروف ادبا کا سوانحی خاکہ بھی پیش کر سکیں اور ان کی تحریروں کے منتخب نمونے بھی۔

قومی کونسل نے اس سلسلے میں موجودہ اہم اردو فنکاروں کی خدمات حاصل کی ہیں اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم قارئین کو براہ راست اپنے اس تجربے میں شامل کریں۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اہم ادیبوں پر مونوگراف شائع کر دیں اور یہ بھی کوشش ہے کہ یہ مونوگراف معلومات کا ذخیرہ بھی ہو، اب اس معیار کو ہم کس حد تک حاصل کر سکے اس کا فیصلہ آپ کریں گے لیکن آپ سے یہ گزارش ضرور ہے کہ اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیں ضرور نوازیں تاکہ ہم آئندہ ان مشوروں کو نشانِ منزل بنا سکیں۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈائرکٹر

فہرست

	ابتدائیہ	VII
1۔	شخصیت و سوانح	1
2۔	ادبی و تحقیقی سفر، تصنیفات و تالیفات کی مشمولات کا جائزہ	21
3۔	تنقیدی محاکمہ	79
4۔	مصنف کی تحریروں کا جامع انتخاب	87

ابتدائیہ

اعلیٰ ادب زندگی کی عظیم سچائیوں اور ادیب کے گہرے روحانی سوز و پیش اور آشوب آگہی کا مظہر ہوتا ہے۔ ہر حساس ادیب اپنی خداداد عبقریت اور باطنی صلاحیت کے ذریعہ اس کائنات آب وگل کے متوازی روحانی ترفع اور دائمی لطف ولذت کی حامل تخیل وتصور کی ایک نئی، بامعنی اور نسبتاً زیادہ کشادہ اور دلکش کائنات خلق کرتا ہے۔ مُلّا رموزی کا شمار بھی ایسے ہی حقیقت پسند، حساس اور فرض شناس شعرا وادبا میں ہوتا ہے۔

ملّا رموزی اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ تھے۔ ان کے گھریلو معاشی حالات بھی اطمینان بخش نہیں تھے۔ انھوں نے جس وقت آنکھ کھولی وہ زمانہ سیاسی اور معاشی اعتبار سے انتہائی انتشار اور بدحالی کا تھا۔ انگریزوں کے جابرانہ رویے کے سبب ہندستان اور ہندستانی افراد شدید ترین معاشی اور سیاسی بحران میں مبتلا تھے اور اظہار کی آزادی پر بھی قانونی شکنجے کسے ہوئے تھے۔ ایسے گھٹے ہوئے حبس زدہ ماحول میں باوقار انداز میں سر اُٹھا کر جینا اور حقوق طلبی کے لیے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرنا جرأت مندانہ عمل تھا۔

ہندستانیوں کے خلاف برطانوی حکومت کی سازشیں نقطۂ عروج پر تھیں۔ ہندو مسلمان کی تفریق اور ان کے مابین پیدا ہونے والی غلط فہمیاں حالات کو مزید بدتر بنائے ہوئے تھیں۔ بڑھتے ہوئے مغربی تہذیب کے اثرات نے نئی نسل کو مشرقی اقدار وروایات سے بے بہرہ

کر دیا تھا۔ زندگی کے ہر محاذ پر ہندستانی افراد شدید ترین مایوسی اور شکست خوردگی کا شکار ہو چکے تھے، لہٰذا انھیں بیدار کرنے، باعمل بنانے، ان میں حب الوطنی اور مذہبی یگانگت کا جذبہ پیدا کرنے اور ملک کو آزاد کرانے کی خاطر جن ادیبوں نے اپنا خونِ جگر صرف کیا، ان میں ملّا رموزی کا نام بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔

ملّا رموزی کی شخصیت اور ادبی خدمات سے متعلق یہ مونوگراف (یک موضوعی مقالہ) دراصل، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی کے ایک خصوصی منصوبے کے تحت قلمبند کیا گیا ہے۔ جس میں ملّا رموزی کی شخصیت، سوانحی کوائف، تصانیف اور ادبی خدمات کے تنقیدی تجزیے کے ساتھ ان کی تخلیقات کا انتخاب بھی شامل ہے۔

امید ہے کہ اس مونوگراف کے مطالعے سے موجدِ گلابی اردو، ملّا رموزی کی شخصیت، ماحول اور طویل گراں قدر ادبی خدمات کو سمجھنے میں اور ان سے متعلق رائے قائم کرنے میں نہ صرف آسانی پیدا ہوگی بلکہ ان پر تحقیقی، تنقیدی کام کرنے کی راہ ہموار ہو سکے گی۔ اس مونوگراف کی تیاری میں کرم فرما، برادر محترم پروفیسر عتیق اللہ صاحب اور ملّا رموزی کے بیٹے جناب رفعت رموزی نے جو رہنمائی فرمائی ہے اس کے لیے میں ان دونوں صاحبان کا سپاس گذار ہوں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اربابِ حل و عقد اور مونوگراف کمیٹی کے جملہ اراکین خصوصاً پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین (ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نئی دہلی) کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

محمد نعمان خاں

شخصیت وسوانح

محمد صدیق رشاد، ضیاء الملک، توحیدی، عشی، ملّا رموزی، 21 مئی 1896 مطابق 7 رذی الحجہ 1313 ہجری کو اپنے آبائی مکان، واقع محلہ چھاؤنی ولائیتیان، بھوپال کے ایک معزز مذہبی افغان خانوادے میں پیدا ہوئے۔ملّا رموزی کے والد کا نام محمد صالح اور والدہ کا نام صغرابی تھا۔ان کے اجداد افغانستان سے ہجرت کر کے ہندستان آئے تھے۔ملّا رموزی نے ایک مضمون میں اپنے اسلاف سے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''میرے تایا عبدالصمد خان اور والد محمد صالح افغانستان سمت شمالی صوبہ، بدخشاں کے قصبہ کاکل کے باشندے تھے۔
>
> یہ اور میری والدہ مرحومہ یہاں سے چل کر ہزارہ، مظفر نگر، جلال آباد اور تھانہ بھون میں رہے۔اتفاق سے کسی نے مشورہ دیا کہ آپ ذی علم ہیں اور اس قصبۂ جلال آباد کے ایک رئیس، احمد علی خاں بہادر، احتشام الملک، سلطان دولہا، حضرت نواب سلطان جہاں بیگم کے شوہر ہیں۔اگر آپ ان تک پہنچ گئے تو کافی قدر ہوگی۔دونوں بھائی وہاں سے بھوپال آئے اور نواب صاحب کی حضوری میں پہنچتے ہی تایا صاحب کو نواب صاحب نے اپنا اتالیق اور والد صاحب کو معتمد روبکاری مقرر فرمایا۔''

(ماخوذ ،ملّا رموزی کا بیان نامہ،مطبوعہ:'معیار ادب' مدراس جنوری 1952)

ملاّ رموزی اوران کے اجداد کی مادری زبان پشتو تھی۔ملاّ رموزی کے والد محمد صالح کی پانچ اولادوں میں سب سے بڑے ملاّ رموزی تھے۔ان سے چھوٹی بہن صابرہ بلقیس،دو بھائی محمد صادق اور محمد ساجد اور سب سے چھوٹی بہن صغیرہ برجیس تھیں۔

ملاّ رموزی کی شادی 7 رجون 1929 کو بھوپال میں انوری بیگم سے ہوئی تھی۔جن سے تین بیٹے،شوکت رموزی،صولت اقبال رموزی،رفعت اقبال رموزی اور ایک بیٹی ملکہ آصف جہاں تولد ہوئے۔شوکت رموزی اور صولت اقبال رموزی کا انتقال ہو چکا ہے۔رفعت اقبال رموزی اور ملکہ آصف جہاں بقید حیات ہیں۔

ملاّ رموزی کی اردو،عربی،فارسی کی ابتدائی تعلیم حسب روایت گھر پر ہی ہوئی۔وہ ذہین انسان تھے اس لیے نو برس کی عمر میں ہی انھیں قرآن کریم کے حفظ کے لیے مدرسہ مسجد سلطانی اتوارہ میں داخل کر دیا گیا تھا۔

اپنی نامکمل غیر مطبوعہ سوانح میں انھوں نے لکھا ہے:

> ''قدرت نے مجھ سے میری عمر کے نویں سال ہی سے عظیم دماغی کام لینا شروع کر دیا........اور میں لگا تار حفظ قرآن میں مصروف ہو گیا۔''

ملاّ رموزی نے تین سال کے اندر یعنی بارہ سال کی عمر میں حفظ قرآن مکمل کر لیا تھا۔ مزید تعلیم کے حصول کے لیے انھیں بھوپال کے مدرسۂ سلیمانیہ میں داخل کر دیا گیا۔ملاّ رموزی میں ذہانت اور طباعی کے ساتھ شرارت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی لہٰذا مدرسہ میں نہ خود چین سے بیٹھتے اور نہ ہی اپنے ساتھیوں کو چین سے رہنے دیتے تھے۔ان کے ایک ہم جماعت،حیات مہری نے ان سے متعلق خاکے میں لکھا ہے:

> ''یہ دن بھر پڑھنے سے بہت گھبراتا تھا۔مدرسہ سے کافی بھاگتا۔یہ خود بھی بھاگتا اور ساتھ مجھے اور دوسرے طلبا کو بھی لے بھاگتا اور تمام دن حبیب گنج اسٹیشن کے چٹیل میدانوں،سرسبز مرغزاروں اور شہر کے مشرقی باغات میں لیے پھرتا........لڑنے مرنے کے موقع پر خود آگے رہتا اور ہماری اور اپنی تعلیم کے سلسلے کو اتنا بے ربط کر دیتا کہ ہم گھر جاتے تو والدین کی مار کھاتے اور مدرسے میں

استاد کے چانٹے''۔ (ماخوذ: ملا رموزی کا خاکہ، مشمولہ مشاہیر بھوپال، ص 27)

گھر کے کمزور معاشی حالات اور اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہونے کے سبب ملاّ رموزی کی تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا اور صغر سنی ہی میں انھیں ریاست بھوپال کے دفتر مُکل میں نقل نویسی کی نوکری کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس سلسلے میں اپنی غیر مطبوعہ خودنوشت میں انھوں نے لکھا ہے:

''والد صاحب کے اپنے دینی معتقدات کی وجہ سے مجھے انگریزی تعلیم سے ہٹا کر دینی تعلیم پر پابند کیا گیا۔ ابھی میں چھٹی جماعت ہی میں تھا کہ مجھ سے اپنے والدین اور چھوٹے چھوٹے چار بہن بھائیوں کی مالی تکالیف دیکھی نہ گئیں اور اس احساس سے میں نے تعلیم ترک کر کے والد کے دفتر (دفتر مُکل) میں اجرت کے کام میں حصّہ لینا شروع کر دیا۔ جس سے میں حسب دل خواہ تعلیم نہ پاسکا۔''

شخصیت:

بے مثل ادیب ظریف، اخبار نویس، کالم نگار، منفرد شاعر اور موجد ''گلابی اردو'' ملاّ رموزی کی شکل وصورت اور عادات ومزاج کے متعلق پروفیسر لیاقت حسین (پونہ) نے کتاب ''ملاّ رموزی'' مؤلف حسن صولت جالندھری (مطبوعہ 1935) کے مقدمے میں لکھا ہے:

''دبلے پتلے لاغر اور تھکے ہوئے۔ کہیں بھٹکے ہوئے سے اور کہیں سنبھلے ہوئے۔ آنکھیں غضب کی حسین اور دنیا کو غلام بنانے والی چمک کی مالک نصف گھنی مونچھیں نزلے کے شکار سے نصف کے قریب سر اور مونچھوں کے بال سفید، چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئیں، دنیا ومافیہا سے کھوئے ہوئے سے مگر اپنی ذمے داریوں اور فرائض کی بجا آوری میں آندھی، طوفان، سیلاب، پتھر اور فولاد، سراپا عمل، محنت اور جفاکشی، ہمت حوصلہ، استقلال، استقامت، احتیاط، مآل اندیشی، غور وفکر، اور مشورہ کے عاشق۔ لطیف، ظریف، حسن پسند، نفیس، حلیم، بدقسمت، بے یار ومددگار، بے شر وبے ضرر، بے خوف، بے خطر، مست،

مدہوش، مگر مسائل کے حل میں بلا کے ذہین، بزرگوں اور عورتوں کے احترام کا نمونہ، مذہب اور مشرق کی تعلیمات وتہذیب کے حامل، مغربی زندگی کے دشمن۔ گفتگو میں لطیف تر مگر مخالف کے مقابل اجڈ، اکھڑ، تلخ، تند، تیز، بجلی، طوفان......اول نمبر کے لڑاکا......مگر عمل میں مستعد، پان اور چائے کے مریض، ....نفیس، نازک لباس کے دشمن مصطفیٰ کمال پاشا اور رضا شاہ پہلوی کے واقعات وحالات کے عاشق وحافظ ....پست، بے ہمت، اور قناعت پسندوں کے دشمن۔"

اساتذہ اور احباب:

علامہ محوی صدیقی، مولوی عبدالحلیم، مولانا آزاد سبحانی، حسرت موہانی وغیرہ اساتذہ نے ملاّ رموزی کو زبان وادب وعلم سیکھنے سکھانے میں رہنمائی کی۔ اِن اساتذہ سے متاثر ہو کر اور تربیت حاصل کر کے ملاّ رموزی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ ملاّ رموزی کے ساتھیوں اور بے تکلف دوستوں میں عظمت بھوپالی، مولوی محمد علی، حیات مہری، فہمی بھوپالی، عبدالہادی انصاری، طرزی مشرقی، سید عابد علی وجدی الحسینی، رشدی بھوپالی، فکری بھوپالی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ان میں سے بعض دوست ان کے ہم جماعت تھے تو بعض کا تعلق ادبی اور قلمی دوستی کے سبب تھا۔ یہی وہ ادبی دوست تھے جن سے ملاّ رموزی مختلف علمی، ادبی اور سیاسی معاملات ومسائل پر کھل کر بحث کرتے اور اپنی تحریروں سے متعلق اپنے موقف کا اظہار کرتے تھے۔

مشاغل:

ملاّ رموزی فطرتاً آزاد منش تھے۔ زندگی اور سماج۔ سے متعلق رائے قائم کرنے میں وہ اپنے مشاہدات وتجربات سے کام لیتے تھے مختلف قسم کے پتھروں کو جمع کرنا اور ان پر تحقیق کرنا، لکھنا، پڑھنا، غور وفکر کرنا علم نجوم، کھیل کود، کبوتر بازی، پہلوانی، سیر وتفریح، شکار اور یار باشی ان کے محبوب مشاغل تھے۔

مطالعے کا شوق انھیں بچپن سے تھا اور اس کی ترغیب انھیں ان کے والد نے دی تھی۔
مطالعے کے اسی شوق نے انھیں لکھنے کی طرف مائل کر دیا تھا۔اس سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے:

''والد صاحب نے میری استعداد اور واقفیت بڑھانے کے جذبے سے مجھ کو روزانہ اخبار پڑھنے کی تاکید کی......اور میں لگاتار اخبار پڑھتا رہا جس سے قومیات کے فرائض کے اثر نے اور دباؤ ڈالا۔''

(ماخوذ: ملا رموزی کی غیر مطبوعہ سوانح ص5)

اسفار:

سفر وسیلۂ ظفر مثل مشہور ہے اور حقیقت یہ ہے کہ دوران سفر انسان کو کئی اچھے بُرے تجربوں سے گذرنا پڑتا ہے۔فطرت اور زندگی کو قریب سے دیکھنے، سمجھنے، محسوس کرنے، ان سے متعلق رائے قائم کرنے اور سیکھنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔سفر ملاّ رموزی کا ایک خاص مشغلہ تھا۔ انھوں نے چھوٹے، بڑے ہر طرح کے سفر کیے اور ان سے حاصل شدہ تجربات ومعلومات کو اپنی تحریروں میں پیش کر کے عوام وخواص کے لیے بڑے پتے کی باتیں بیان کی ہیں۔ان کے اسفار اور ان سے حاصل شدہ معلومات کے سبب ان کی تحریروں میں موضوعات کا تنوع، گہرائی، جغرافیائی، سیاسی، سماجی، تہذیبی، تمدنی، علمی معلومات کا ایسا ذخیرہ محفوظ ہو گیا ہے جو ہماری تاریخ کے قیمتی اثاثے کی حیثیت رکھتا ہے اور جسے ان کے مخصوص طرز اسلوب نے اور بھی دلچسپ، مفید اور اہم بنا دیا ہے۔

ملاّ رموزی نے غیر منقسم ہندوستان کے جن شہروں کا سفر کیا اور وہاں قیام پذیر رہے، ان میں بمبئی، دہلی، کانپور، علی گڑھ، ناگپور، برہان پور، لاہور وغیرہ کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔

1931 میں انھوں نے اپنے اجداد کے وطن افغانستان کا سفر کیا۔ملاّ رموزی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'عورت ذات' کی اشاعت کے لیے اپریل 1931 میں لاہور کا سفر کیا تھا۔ یہاں وہ حفیظ جالندھری کے گھر مہمان رہے اور لاہور کی مختلف علمی ادبی انجمنوں اور سبھی اہم اخبارات کے مدیران نے ان کے اعزاز میں خصوصی نشستیں اور دعوتیں منعقد کیں۔لاہور کے سبھی

اخبارات نے ان کی آمد اور لاہور میں ان کی مصروفیات سے متعلق خبریں شائع کی تھیں۔

21 اپریل 1931 کے اردو روزنامہ ''بندے ماترم'' میں اس خبر سے ان کے سفر اور قیامِ لاہور اور ان کے اعزاز میں منعقدہ تقریبات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''ملا رموزی لاہور میں''

ادبی حلقوں میں پرجوش خیر مقدم

لاہور۔21 اپریل۔گلابی اردو کے موجد، ملک کے مشہور ظرافت نگار ملا رموزی چند دنوں سے لاہور میں تشریف فرما ہیں۔لاہور کے ادبی حلقوں میں ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ آپ کے اعزاز میں ہر روز جلسہ ہائے ضیافت منعقد ہوتے ہیں۔سنیچر کی شب کو لالہ کرم چند ایڈیٹر 'پارس' نے ایک پُر تکلف دعوت دی جس میں پنجاب کے سرکردہ ہندو مسلم ادیبوں کو ملا صاحب کے تعارف کا موقع دیا گیا۔آج مولانا ظفر علی خان صاحب نے ملا صاحب کے اعزاز میں دعوت طعام دی۔کل مولوی نور الحق مالک مسلم ادبی لٹد. اور پرسوں عبد القوی صاحب کے یہاں چائے نوش فرمائیں گے ۔ملا صاحب یہاں اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''عورت ذات'' کو زیور طبع سے آراستہ کرانے آئے ہیں۔''

25 اپریل 1931 کے شمارے میں اخبار ''زمیندار'' لاہور میں نمایاں طور پر یہ خبر شائع ہوئی تھی:

''ضیاء الملک ملا رموزی کی گلابی سرگرمیاں''

پنجاب لٹریری لیگ کا جلسہ

لاہور۔25 اپریل۔پنجاب لٹریری لیگ کی سرکردگی میں ایک جلسہ زیر صدارت حکیم احمد شجاع، 27 اپریل کو شام کے سات بجے وائی، ایم، سی، اے، ہال لاہور میں منعقد ہوگا۔ضیاء الملک ملا رموزی حاضرین سے اپنے مخصوص انداز میں دو چار باتیں کریں گے۔مولانا حفیظ جالندھری اپنی نظموں سے حاضرین کو محظوظ فرمائیں گے۔''

ملا رموزی نے لاہور میں چند دن قیام کیا پھر افغانستان میں مقیم اپنے اعزا کے اصرار پر وہ لاہور سے افغانستان روانہ ہو گئے۔افغانستان کے اس سفر سے متعلق انھوں نے لکھا ہے:

''1931 میں اپنی پھوپی اور خالہ صاحبہ کے شدید بلاوے پر میں افغانستان گیا ''گلابی اردو'' کی شہرت اور مقبولیت سے پشاور ہی سے روَسانے مجھے گلے لگایا اور یہ معلوم کر کے کہ میں پشتو داں اور فارسی داں ہوں آزاد قبائل تک نے میری میزبانی میں ایسے ایسے گوشت کھلائے کہ اب فردوس میں ملیں تو ملیں ورنہ اس مبزی اگاؤ ہند میں تو نصیب نہیں ہو سکتے۔''

(ماخوذ: ملا رموزی کا بیان نامہ، معیار ادب جنوری 1952)

بھوپال کے جن نامور علما اور ادبانے بھوپال کو ملک گیر ہی نہیں عالم گیر سطح پر متعارف کرایا ہے ان میں نواب صدیق حسن خاں، مولانا برکت اللہ بھوپالی (وزیر اعظم حکومت موقتہً ہند) کے بعد تیسرا اہم نام ملّا رموزی کا پیش کیا جاسکتا ہے۔

ملازمت اور ذریعۂ معاش:

ملّا رموزی اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اور ان کے والد کی تنخواہ کم ہونے کے سبب گھریلو اخراجات بہ مشکل پورے ہو پاتے تھے اس لیے ملّا رموزی نے صغر سنی ہی میں تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے والد کے دفتر میں نقل نویسی کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔

جب اس ج دئی سی ملازمت کے باوجود گھر کے معاشی حالات بہتر نہ ہو سکے تو ان حالات سے نجات حاصل کرنے کی خاطر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انھوں نے ''دارالالٰہیات'' کانپور میں مقیم رہ کر فاضل الٰہیات کی سند حاصل کی لیکن اس سے بھی کوئی بڑی نوکری حاصل نہ ہو سکی البتہ وحیدیہ ٹیکنیکل اسکول بھوپال میں ان کا تقرر مدرس کی حیثیت سے ہو گیا۔ اس ملازمت سے بھی وہ مطمئن نہیں تھے لہٰذا کچھ عرصہ تک مدرّسی کے فرائض انجام دینے کے بعد انھوں نے اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور پورے طور پر لکھنے پڑھنے کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ ان کی تحریریں ملک کے سبھی اہم اخبارات ورسائل میں شائع ہونے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا شمار ملک کے اہم ادیبوں، فکاہیہ کالم نگاروں میں ہونے لگا اور پھر انھوں نے قلم کو ہی اپنا ذریعہ معاش بنالیا۔

ریاست بھوپال کے وزیر تعلیم سر راس مسعود اور مولانا شوکت علی کی سفارش پر انھیں ریاست بھوپال کی جانب سے 40 روپیہ ماہوار وظیفہ جاری ہوا جو آگے چل کر سو روپے ماہوار ہو گیا تھا لیکن سر راس مسعود کے انتقال کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔ اس طرح ملا رموزی کو بچپن سے لے کر آخری عمر تک کبھی بھی معاشی فارغ البالی نصیب نہ ہو سکی۔ ان کی زندگی عسرت اور مالی پریشانیوں میں ہی بسر ہوئی لیکن معاشی بدحالی کے باوجود ان کے قلم کی رفتار تھم نہ سکی اور ان کی زودنویسی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ شاید اس زودنویسی کی وجہ ان کی معاشی ضروریات تھیں جن کے سبب قلم ہی ان کا ذریعۂ معاش بن گیا تھا۔ تمام اہم اخبارات کے مدیران ان سے فکاہیہ کالم لکھنے کی فرمائش کرتے تھے اور وہ حسب فرمائش اپنے فکاہیہ کالموں کو بذریعہ وی. پی روانہ کر دیتے تھے۔

شہرت اور مقبولیت:

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے ملا رموزی نے اپنی تخلیقات سے کم سنی اور کم وقت میں ہی ملک گیر شہرت حاصل کر لی تھی۔ ملک کے سبھی اہم اخبارات و رسائل کے مدیران، مصنفین، شعرا و ادبا ان کی خلاّقانہ ادبی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ جب ملا رموزی کی شادی ہوئی تو انھیں مبارک باد دینے اور ان پر سہرے لکھنے والوں میں مقامی اور غیر مقامی شعرا بھی شامل تھے۔ یہاں حفیظ جالندھری، علامہ محوی صدیقی اور احسن مارہروی کے تحریر کردہ سہرے کے اشعار اس لیے پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ ان کے مطالعے سے ملا رموزی کی ادبی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جا سکے۔ حفیظ جالندھری نے اس موقع پر اس طرح منظوم خراج تہنیت پیش کیا تھا۔

ادب میں تیرے سر ہے، طرزِ نو ایجاد کا سہرا　　تری نکتہ نوازی کو ملا استاد کا سہرا
تری سیرت نے باندھا فطرت آزاد کا سہرا　　ہوا ان سب پہ طرّہ اس مبارک باد کا سہرا

مرے پیارے رموزی اب تجھے شادی مبارک ہو
یہ ایزادی مبارک ہو، خانہ آبادی مبارک ہو

ملا رموزی کے استاد علامہ محوی صدیقی نے ملا رموزی کی شادی پر لکھے گئے اپنے سہرے میں ان کی شخصیت اور ادبی خدمات کا اعتراف اس طرح کیا ہے۔

پھر حریف نظارہ دیدۂ تمنا ہے   اک عروس مہ پارہ روکش نظارہ ہے
عشرتوں سے ہے معمور آج دل کا کاشانہ   واقعہ بنا ہے اب تھا جو ایک افسانہ
حضرت رموزی کی یعنی ہوگئی شادی   دل کے غم کدے میں ہے عشرتوں کی آبادی
کیوں کسی کا فریادی دل ہو اب رموزی کا   دل کا تھا جو اک ارماں ہوگیا ہے وہ پورا
وہ ادب کی دیوی ہے، وہ عروس اردو ہے   بازوے رموزی پر جس کا آج گیسو ہے
جس کا جلوۂ رنگیں رشک صد نمائش ہے   ہر زبان پہ جس کا نغمۂ ستائش ہے
کون؟ وہ رموزی جو ایک ظریف ہے یکتا   جس کا کلک اک دریا اور وہ بھی گوہر زا
ہو مبارک ! اے ملا عشرتوں کی یہ گھڑیاں   ختم ہوگئیں آخر رنج و فکر کی گھڑیاں
خدمت ادب کا ہے تیرے سر سہرا   اس سے بڑھ کے کیا ہوگا روکشِ نظر سہرا
وہ عروس رعنا ہے تیری خلوت دل میں   آرزوئے ہر دل ہے اب جو ساری محفل میں
زندگی میں جو تونے خدمت وطن کی ہے   یہ صلہ اسی کا ہے یہ جزا اسی کی ہے
ملک وقوم میں عزت آج تونے یوں پائی   ہر ادیب اور شاعر جس کا ہے تمنائی
پیکرِ ظرافت میں روح پھونک دی تونے   ترے سبب انگڑائی لی عروسِ اردو نے

جنت ادب کا آج تیرے سر ہی سہرا ہے
تیری ہم آغوشی اس دلہن کو زیبا ہے

معروف استاد شاعر احسن مارہروی اور ثاقب کانپوری نے بھی سہرے لکھے تھے۔ احسن مارہروی کا سہرا اس طرح اپنی بہار دکھا رہا ہے۔

جس ابتدائے مسرت کی ہے خبر سہرا   اسی خوشی کا ہے ملا تمھارے سر سہرا
بہار عقد کی رنگینیاں ہیں چھائی ہوئی   بنا ہوا ہے چمن زار سر بہ سر سہرا
بڑے ریاض سے گوندھا ہے اس کو مالن نے   کہ باندھنے کو ہے آج ایک ذی ہنر سہرا
چمن کی سیر کرو گھر میں انجمن والو   یہ دے رہا ہے تمھیں دعوت نظر سہرا
کلی کلی ہو نہ کیوں اس کی راز سربستہ   بنا ہے جبکہ رموزی کے نام پر سہرا
نہ بار اس کا جبیں پر نہ بوجھ ہے سر پر   دکھا رہا ہے لطافت کا یہ اثر سہرا

ہے رسمِ کہنۂ عقد، آبرو و معیشت کی　　رہے گا اس سے تروتازہ عمر بھر سہرا
نیا یہ مسئلہ حل پرتو افگنی کا ہوا　　کہ شمس بازغہ چھپا ہے تو قمر سہرا
ملے نہال تمنا کا پھل رموزی کو　　دعا ہے دل سے کہ ہو جلد بارور سہرا
مرض جو پست نہ کرتا تو آج میں احسن
بلند کیا ہے، سناتا بلند تر سہرا

(ماخوذ:مطبوعہ'شادی'ص217-18)

وفات:

10رجنوری1952 کو56سال کی عمر میں بھوپال میں ملّا رموزی کا انتقال ہوا اور ان کے گھر کے نزدیک واقع محلہ چھاؤنی ولایتیان کے قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ان کے انتقال پُرملال پر بھوپال ہی میں نہیں ملک کے مختلف شہروں میں تعزیتی جلسے منعقد کیے گئے۔تعزیتی قراردادیں پیش کی گئیں،مختلف شعرانے تاریخی قطعات کہہ کر انھیں منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔بھوپال کے معروف شاعر سید محمد یوسف قیصر بھوپالی نے اپنا منظوم خراجِ عقیدت اس طرح پیش کیا تھا:

کیوں نہ ہوں غم گیں وحزوں خوش نوایانِ چمن　　اب نہیں اس باغ میں وہ عندلیب نغمہ زن
نغمۂ رنگیں سے جس کے یہ چمن معمور تھا　　جس کے نغمے بن گئے تھے تازگی بخشِ چمن
وہ ادیب خوش بیاں ملا رموزی جو کہ تھے
بے گماں، روحِ روانِ محفلِ اربابِ فن
کس قدر ذوقِ ادب ان کا تھا رفعت آشنا　　دلکش و دلچسپ تھی رنگینی شعر و سخن
تھے حقیقت میں وہی شانِ ادب جانِ ادب　　جن کے دم سے بن گئی تھی آسماں خاکِ وطن
جن کے مرموزات کی شیریں کلامی دیکھ کر　　نام کو باقی نہیں تھی تلخیِ کام و دہن
پھر مقالاتِ رموزی ہوئی حدیثِ شوقِ دل　　چھیڑ دے کوئی وہی دلچسپ موضوعِ سخن
مضطرب دل ہے نکاہاتِ رموزی کے لیے　　جو کہ ہے اپنی مسرت پر ہمیشہ نوحہ زن

منتظر ہے اک ذرا سی مسکراہٹ کے لیے — دل کہ جو ہر وقت ہے معمورۂ رنج و محن
قلب پر جس کے نہ ہونے سے اداسی چھا گئی — اک کمی محسوس تو کرنے لگے اربابِ فن
دیکھ سکتی ہی نہیں ملّا کو یہ آنکھیں کبھی — سن نہیں سکتے زباں سے ان کے کچھ شعر و سخن
رہ گئے بن کر زمانے میں وہ زیب داستاں — جس کو دہراتے رہیں گے شوق سے اہلِ وطن

گو کہ ہیں غمگیں مگر لب پر دعائے خیر ہے
رکھے ان کی روح کو مسرور ربّ ذوالمنن

ملّا رموزی کی وفات پر بھوپال میں منعقدہ تعزیتی جلسوں میں سے ایک عوامی تعزیتی جلسے کی روداد (مطبوعہ روزنامہ 'الجمعیت' نئی دہلی 20 رجنوری 1952) بغرض مطالعہ پیش کی جاتی ہے:

''گلابی اُردو کا ہرا بھرا چمن اجڑ گیا''

بھوپال میں آفتابِ مزاح کے سوگ میں جلسہ

بھوپال۔ (بذریعہ ڈاک) سرزمین ہند کے مایۂ ناز مزاح نگار حضرت ملّا رموزی کے سوگ میں بھوپال کے ادبی اداروں: ''حلقہ اربابِ ادب'' ''مشعلِ ادب'' اور ''تعمیر ادب'' کا مشترکہ جلسہ وکیل محمد عسکری کی صدارت میں 14 رجنوری 1952 کو پیر دروازہ کے بازار میں ہوا۔ اس کی ابتدا قیصر بھوپالی کی نظم سے شمیم خاور نے کی۔ بعدازاں ملّا جی کے دیرینہ رفیق مولانا طرزی مشرقی نے تقریر کرتے ہوئے کہا: ''ملّا رموزی نے بھوپال کی خصوصیات کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے''۔ انھوں نے اپنا ذاتی تعلق بتاتے ہوئے کہا: ''مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میرا کوئی دوست نہیں سگا بھائی مر گیا ہو''۔ آفاق احمد نے تمام جماعتوں کی طرف سے تقریر کرتے ہوئے ملّا جی کی لطیف مذاق کی حامل چند داستانیں سنائیں۔ انھوں نے ملّا رموزی کے تاریخی مقام کا جائزہ لیتے ہوئے کہا: ''ملا رموزی نے گلابی اردو کے ذریعے طنز و مزاح کے مناسب ترین امتزاج سے اردو ادب کو ایک نیا مزاج بخشا ہے۔''....... اختر سعید خاں نے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا: ''اور یہ دیدہ ور اپنے پیدا کرنے والے سے جاملا۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جس نے عمر بھر ہمیں ہنسایا آج ہم یہاں اس کا ماتم کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں......... یہ خلا نہ صرف ہمارے درمیان ہی ہے بلکہ اردو ادب بھی اس سے بچا نہ رہ سکا۔'' اس جلسے میں یعقوب صاحب ایڈوکیٹ

نسیم کوثر، باسط اجینی، ظفر آرٹسٹ اور شوکت پرویز نے بھی ملّا رموزی کے متعلق اظہار خیال فرمایا۔
آخر میں عسکری صاحب نے تعزیتی قرارداد پیش کی جو حسب ذیل ہے:

''بھوپال کی تمام ادبی جماعتوں کا یہ مشترکہ جلسہ سرزمین ہند کے مایۂ ناز فرزند ضیاء الملک حضرت ملّا رموزی کی موت پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ ملّا صاحب 35 سال اُردو ادب اور ملک و قوم کی خدمت میں سرگرم عمل رہے تھے۔ آپ نے جس وقت ادبی دنیا میں قدم رکھا، ماحول پر اُداسی مسلط تھی لیکن آپ نے اپنی شاہکار تصنیف ''گلابی اردو'' کے ذریعے اردو ادب کو نیا مذاق بخشا۔ عموماً آدمی اپنے وطن سے پہچانا جاتا ہے لیکن صرف ملّا صاحب کو یہ فخر حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے وطن بھوپال کو تمام دنیا میں ادبی حیثیت سے روشناس کرایا۔ ملّا صاحب کی موت سے اردو ادب کو نہایت نقصان پہونچا ہے۔ ملّا صاحب ان شخصیتوں میں سے ایک تھے جو کہ نہ صرف اپنے وطن میں بلکہ ملایا، برما، انڈونیشیا، اور دوسرے ملکوں میں بے حد مشہور و مقبول تھے۔ اس غم میں ہم ان کے پسماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔''

بھوپال میں ملّا رموزی کے یوم وفات کا اہتمام کئی برسوں تک کیا جاتا رہا۔ ان کے پہلے یوم وفات پر منعقدہ خصوصی جلسے میں بھوپال کے معروف طرحدار شاعر محمد علی تاج بھوپالی نے ملّا رموزی کو تاج محل سے موسوم کرتے ہوئے اپنے منظوم خراج عقیدت کا اظہار اس طرح کیا تھا:

نظم و افسانہ و اشعار و غزل رکھتے تھے　　یعنی ہر فن میں زمانے کا بدل رکھتے تھے
طنز کے تیر میں ست رنگ کنول رکھتے تھے　　زندہ جاوید حریفانِ اجل رکھتے تھے

یومِ ملّائے رموزی پہ یہ محسوس ہوا
ہم بھی بھوپال میں اک تاج محل رکھتے تھے

ملّا رموزی کے وفات کے موقع پر روزنامہ ''نئی زندگی'' حیدرآباد نے حسب ذیل عنوان سے تاریخی قطعہ شائع کیا تھا:

''قطعہ تاریخ وفات ادیب شہیر، صاحبِ طرزِ بےنظیر، ملاّ رموزی بھوپالی''

تلاش ان کو دنیا میں کرنا عبث ہے   فلک پر ہیں وہ اب زمیں پر نہیں ہیں
تقدس فرشتوں کا حاصل ہے ان کو   رموزی جمالِ بہشتِ بریں ہیں

(1371ہجری)

اخبار ''دبدبہ سکندری'' رام پور (شمارہ 9 جلد 9) کے مدیر نے ملاّ رموزی کی وفات کی خبر بلاک میں نمایاں طور پر اپنے اخبار میں اس طرح شائع کی تھی:

''آہ حضرت ملاّ رموزی''

افسوس ہزار افسوس 12 ربیع الآخر 1371 ہجری یوم جمعہ کو اردو ادب کا یہ درخشندہ ستارہ جس نے اپنی علمی ضوفشانی سے ہندوستان بھر کے طول وعرض میں اپنی ضیاباری کا سکہ بٹھادیا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ملاّ رموزی کا مرتبہ گلابی اردو کے موجد اور بانی ہونے کی حیثیت سے اردو ادب میں نہایت بلند تھا۔ وہ اپنے مضامین ایسے لطیف اشاروں اور کنایوں سے لکھتے تھے کہ اہل علم پھڑک جاتے تھے۔ دبدبۂ سکندری پر بھی خاص التفات تھا۔ افسوس ایک نادرالوجود ہستی کے کم ہوجانے کو ہم پوری اسلامی قوم کا نقصان تصور کرتے ہیں اور مرحوم کے لیے جنت الفردوس کی دعائیں کرتے ہوئے مرحوم کے کل اعزا سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں (مدیر)

ماہنامہ ''معیار'' نے خصوصی اداریہ بعنوان ''ملاّ رموزی مرحوم'' تحریر کیا اور اردو ادب کا ناقابلِ تلافی نقصان ظاہر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ:

''ملا میں اپنی زندگی کے آخری سالوں میں کچھ نئی خصوصیات ابھر رہی تھیں۔ اگر وہ جیتے رہتے تو توقع تھی کہ وہ اپنے ادب کو ایک نئی زندگی بخشتے۔ نئی تابناک قدروں اور خدا پرستانہ انقلابی مقصد سے اپنے مزاح کی ایک نئی رنگ آمیزی کرتے جس سے ان کی ''گلابی اردو'' قرمزی چمک دار ہوجاتی لیکن موت کا

ایک دن معین ہے۔ قدرت کے اٹل قانون نے مہلت نہ دی اور زندگی کی گاڑی نے مقصد کی شاہراہ پر مڑتے ہی اپنا سفرنامہ ختم کر دیا۔"

(اداریہ'معیار'مارچ1952)

اخبار"اہلِ حدیث" دہلی 15 مارچ1952 میں بعنوان" آہ ملّا رموزی" از ملّا غموزی دہلوی، گلابی اردو کی طرز میں ایک تعزیتی مضمون شائع ہوا تھا جس کی چند سطور بطور نمونہ نقل کی جاتی ہیں:

"اے میرے بھائیو، مسلمانو، ہوا ہے بہت بھاری صدمہ ہمیں۔ مرنے ملّا رموزی کے کا۔ جاتا ہے پھٹا کلیجہ ہمارا غم اس کے سے۔ تھا بڑا بھاری ادیب اور عالم فاضل زمانہ اپنے کا۔ پڑ گئی ہلچل بیچ دنیا اخباری کے بہت قسم اے شہادت ہے اہلِ حدیث اخبار دلی والے کی۔ ہوئے جلسے بیچ یاد اس کی کے بھاری بھاری۔ تھا چودھری اے بڑا سردار اردو گلابی کا وہ۔ بخشے اللہ تعالیٰ رحمت اپنی سے اسے بیچ جنت نعمتوں والی کے درجہ بڑا۔ تھا جو صاحب خوبیوں بڑی کا آدمی بڑا بھاری، لکھے گا اردو گلابی کون اب۔ ملیں گے چٹخارے کہاں اب ہمیں اردو گلابی کے۔ تھا طرز اپنی کا موجد اکیلا وہ۔ ہائے تھا خیر خواہ قوم اپنی کا بڑا۔ تھا رکھتا درد قوم اپنی کا بہت۔ قسم ہے رب نمازوں پانچوں تمھاری کی کے، اے بھائیو، مسلمانو! لائیں گے کہاں سے ہم اس کو اب، چاہیے کہ کریں ہم ریس اس کی۔ کریں پیدا ہم درد قوم اپنی کا ویسا ہی اور کریں خدمت بھائیوں، مسلمانوں اپنی کی ویسی ہی کے تھا کرتا ملّا رموزی مرحوم جیسی بلکہ زیادہ اس سے کہ مثال ماری ہے ایران پٹرول اور ہنگاموں کے ملک والے فارسی شاعر نے۔ ع "باپ اگر نہ سکے بیٹا تمام کرے"۔

ملّا رموزی کے انتقال اور ان کی برسی پر بھوپال کے جن شعرا نے پر تاثیر نظمیں کہی ہیں ان میں محمد علی تاج، حمید قریشی، اور ارشد صدیقی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ارشد صدیقی نے ملّا رموزی کی برسی پر سولہ بندوں پر مشتمل نظم کہی تھی۔ ملّا رموزی کی پہلی برسی پر کہی گئی محمد علی تاج بھوپالی کی مختصر نظم نے گہرا تاثر قائم کیا تھا۔

بھوپال کے معروف شاعر حمید قریشی کی یہ نظم بھی ادبی حلقوں میں بہت پسند کی گئی تھی۔
چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اے ضیاء الملک، اے ملا رموزی، "السلام"
تو رہے گا تا ابد ہر دل میں باصد احترام
ہے بجا گر چہ زباں دانی یہ تجھ کو ناز تھا
یہ گلابی رنگ تیرے نطق کا اعجاز تھا
اور پھر اس پر وہ شوخی جدتِ پرواز کی
ہر نفس میں آج تک ہے گونج اس آواز کی
تیرا اک اک حرف تھا گویا فغانِ زندگی
ڈھالتا تھا زندگی سے داستانِ زندگی
مفلسی و بے کسی و غم کا گہوارہ تھا تو
واقعی اہلِ وطن کی آنکھ کا تارہ تھا تو
تیری تخلیقات میں پنہاں تھی روحِ انقلاب
جس طرح سے ٹوٹ کر پانی سے مل جائے حباب
وقت کا نباض تھا، حساس دل لایا تھا تو
اونگھتے ماحول میں جاں پھونکنے آیا تھا تو

بھوپال کے معروف بزرگ شاعر ظفر نسیمی نے گلابی اُردو میں نثری نظم کہہ کر مُلّا رموزی کے تئیں اپنا خراجِ عقیدت اس طرح پیش کیا ہے:

مُلّا رموزی

(نثری نظم۔گلابی اُردو میں)
ظفر نسیمی

تحقیق۔اوپر اس خطۂ زمیں کے

نام جس کا رکھا تھا بھوجپال
راجہ بھوج نے
اور کہلایا بھوپال کثرتِ استعمال سے
موسوم کیا جس کو جھیلوں کی نگری سے بھی
عرفِ عام میں
تحقیق کیے گئے پیدا اسی خطۂ زمیں پر
بے شمار عالم، مولوی، منشی، فاضل، ادیب اور شاعر
تحقیق لکھی گئیں اُن ادیبوں اور شاعروں کے قلم سے
کتابیں موٹی موٹی
بڑے بڑے حاشیوں والی
اور تحقیق کیا حاشیوں کو بھی آراستہ
فکروفن کے جمال سے
(تحقیق) پایا گیا ایک اہلِ قلم، صاحبِ کمال
ذی فہم، ذی شعور، بے مثال
اُن ادیبوں اور شاعروں کی پہلی صف میں
تحقیق نام تھا اُس کا مُلّا رموزی
پس دکھلائے اُس نے جوہرِ لاجواب
نثر کی گُل کاری سے
اور برسائے گوہرِ نایاب
نوکِ قلم کی فن کاری سے
تحقیق۔ گھومتا رہا وہ بیچ زمیں آسماں کے
اونچی اونچی فصیلوں سے گھرے شہر کی گھاٹیوں میں
سمیٹے دکھ درد لوگوں کے اُس نے

گلی گلی سے
اور تحقیق دے کر ظرافت کا رنگ
سجایا ان کو گل بوٹوں کی طرح
صفحۂ قرطاس پر
ایجاد کی ایک نئی راہ !
تخلیق کیا ایک نیا لہجہ!
اور اِن محنتوں کا صلا؟
جیسی کہ ریت ہے اِس دنیا کی
پہچانی گئی اس کی قیمت
(تحقیق) بعد مرنے کے
پس بنایا گیا ایک محل
یاد میں اُس کی
بیچ نئے اور پُرانے شہر کے
اور رکھا گیا ''ایوانِ ملاّ رموزی'' اس کا نام
جو کہلایا رموزی بھون
مساوات کے نام پر

ملاّ رموزی محض ادیب، شاعر، کالم نگار اور طنز و مزاح نگار ہی نہ تھے بلکہ اردو زبان کے سچے عاشق اور خدمت گار بھی تھے۔ وہ اردو نویسی ہی میں تاعمر مصروف نہیں رہے بلکہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت نیز توسیع و ترقی میں بھی انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مختلف شہروں کے سفر کر کے اور اردو زبان کے حق میں جلسے منعقد کر کے تقاریر کیں اور انجمن ترقی اردو کی شاخیں قائم کیں۔

برہان پور میں انجمن ترقی اردو کی شاخ کے قیام کے سلسلے میں ان کی مساعی کا اندازہ ''انقلاب لاہور'' 18 راگست 1932 میں شائع اس خبر سے لگایا جا سکتا ہے:

"ملا رموزی برہان پور میں"
انجمن ترقی اردو برہان پور کا قیام

حضرت ملّا رموزی، زبان اردو کی حفاظت اور اشاعت کی خاطر دو ماہ سے ممالک متوسط اور برار میں دورہ کر رہے ہیں اور ہر شہر میں انجمن اردو کے قیام کی کوشش فرماتے ہیں۔صوبے کے متعدد شہروں میں اس نوع کی انجمنیں قائم ہو چکی ہیں۔اس قسم کی انجمن کی دو امتیازی خصوصیات یہ ہیں کہ اس کی رکنیت کے لیے چندے کی ضرورت نہیں۔دوسرے اس کے مقاصد کی تکمیل میں نہ کسی کی دل شکنی کا احتمال ہے نہ کسی کی زبان کی مخالفت کا شوق۔غرض صرف یہ ہے کہ صلح جوئی اور امن پسندی کے ساتھ زبان اُردو کی جو کہ اب سب کی قومی زبان ہونے کا حق حاصل کر چکی ہے، تبلیغ ہو اور تحریر میں اُردو کو حتی الامکان رواج دینے کی کوشش کی جائے۔چنانچہ انجمن اردو کے سلسلے میں موصوف بروز جمعہ 5راگست 1932 برہان پور تشریف لائے۔عمائد شہر اور اہلِ قلم اور شعرا حضرات نے ممدوح کا اسٹیشن پر شاندار استقبال کیا۔شام کو پانچ بجے ایک جلسہ جناب استاد مولوی فخر الدین صاحب حاذق کی صدارت میں منعقد ہوا۔ملا صاحب نے اپنی فاضلانہ تقریر میں اپنی تحریک کے مقصد اور پہلے سال کا نظام عمل پیش فرمایا۔بعد ازاں انجمن ترقی اردو برہان پور کا قیام عمل میں آیا۔شب کو ایک نہایت عظیم الشان مشاعرہ ملا رموزی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ملّا صاحب نے اپنے خطبہ صدارت میں موجودہ زمانہ کی شاعری کی بدنظمی اور آج کل کے شعرا کی کہنہ خیالی اور عوام کی بدذوقی پر تقریر کرتے ہوئے اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ آج کل مشاعروں اور کلام کا کیا ڈھنگ ہونا چاہیے۔"

ملّا رموزی ہی وہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے سب سے پہلے اردو یونیورسٹی کے قیام کا نہ صرف نعرہ بلند کیا تھا بلکہ 29 راپریل 1948 کو باقاعدہ تحریک کا آغاز کر کے اس کے حق میں اپنی حسب ذیل تحریر بعنوان: "گاندھی اور اردو یونیورسٹی" 4رجون 1948 کو اخبار "ندیم" بھوپال میں شائع کی تھی:

"گاندھی اور اردو یونیورسٹی"

از ملا رموزی

ہندوستان اور بھوپال میں 1948 کے نصف آخر میں جو سیاسی انقلاب ہوئے ہیں

ان میں گاندھی جی اور اردو کو کافی اہمیت حاصل ہو چکی ہے۔

محترم گاندھی جی کی عمر کے آخری حصے کو خصوصیت سے عوام ہند کی صلاح فلاح سے جو ربط رہا ہے اور ممدوح نے ہندستانی باشندوں کو باہم متحد رہنے کے جو وسائل و دلائل بہم پہنچائے تھے ان میں اردو کو بہر قیمت زندہ رکھنا بھی ممدوح کے نزدیک جس حد تک ضروری تھا اس کے ثبوت میں خود ممدوح کا اس زبان کو سیکھ لینا، اس زبان ہی میں خط و کتابت کرنا اور اس کو باقی رکھنے کے لیے حکومتِ ہند کے ذمے دار افراد پر زور ڈالنا، ممدوح کے سوانح عمل کا ایک ایسا باب ہے جس کو پڑھ کر اور معلوم کر کے ہر وہ شخص جس کو ہندستان اور گاندھی جی سے سچی محبت ہے، اردو کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور ہے۔

29 راپریل 1948 کی تاریخ بھوپال کی سیاسی زندگی میں عظیم ترین تاریخ ہے جب کہ یہاں کے باشندوں کے نمائندوں کو حکومت کرنے کی مقدرتیں حاصل ہوئی ہیں، اس لیے اس تحریک کا یہی وقت موزوں اور مناسب تھا۔

''اردو گاندھی یونیورسٹی'' میری ایسی تحریک ہے جس کو ہندوستان کے ہر صوبے میں قدم جما لینا چاہیے........آج حکومت ہند کا ہر ذمہ دار فرد، ہندستان کا ہر بیدار دماغ انسان، عوام کو نصیحت کر رہا ہے کہ ان کو گاندھی جی کے مطالبات کو سچے دل سے پورا کرنا چاہیے تو کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اردو کی بقا اور ترقی گاندھی جی کا سچا مطالبہ تھا؟

پس گاندھی اردو یونیورسٹی بھوپال سے ایسا ادارۂ علمی و عملی مراد ہے جو عوام کو فلسفۂ گاندھی یعنی متحدہ ہندستانی ذہنیت اور امن عامہ کی تربیت دے گا۔ جو سمجھائے گا کہ زبان اردو ہندستانیوں کا مشترکہ سرمایہ ہے جو گاندھی جی کے فوق الفطرت کردار کارناموں سے آنے والی نسلوں کے دماغ متور کرے گا۔

اب رہا یہ سوال کہ کیا یونیورسٹی ایسے عظیم مرکز معارف کی تحریک کو ملّا رموزی اور بھوپال کامیاب بنا سکتا ہے تو جواب اس لیے اثبات میں ہے کہ ہمیں ہماری تاریخ بتاتی ہے کہ ہماری تمام عظیم ترین فتوحات اور کامیابیوں کا آغاز ہمیشہ ایسے ہی لوگوں سے ہوا ہے جن کی مادّی حیثیت اور دنیوی ذرائع بے حد مضمحل اور افسردہ تھے اور اس کے ساتھ کام کرنے والوں کی تعداد بھی محدود

بے سرمایہ لیکن ایسے ہی کم مایہ اور مضمحل آغاز کرنے والے آخر کار عظیم تر فتوحات اور کامرانیوں سے ہم کنار ہو کر رہے۔ لہٰذا میرے ساتھ بھی اس عظیم تحریک کو چلانے والے چند نحیف الجثہ، ناتواں، بے مایہ مگر عظیم حوصلے اور فولادی عزم کے بھوپالی نوجوان ہیں۔ نہ اپیلوں پر اپیلیں۔ غرض اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ذرائع اختیار اور استعمال نہیں کیے جائیں گے جو ایسے مقاصد کے لیے اتنے استعمال کیے گئے ہیں کہ اب ان کے تصور سے بھی ترقی طلب انسان کا دماغ گندگی محسوس کرتا ہے۔

میں تو صرف بھوپال کے ترقی یافتہ تمکنت سے، بھوپال کے شعلہ آشام سرگرمی سے، بھوپال کی کوہ شکن ہمت سے، بھوپال کی نوجوان نسل کی ظفر مند شجاعت سے، بھوپال کی تاریخی علم دوستی سے سب کچھ کہوں گا اور آگے بڑھتا رہوں گا اور سب سے کامیاب اطمینان یہ ہے کہ اس تحریک کو چار چاند لگانے والا سب قوموں کا خدا میرے ساتھ ہوگا اور بس۔''

یکم جون 1949 کو ریاست بھوپال کا ہند یونین میں انضمام ہو گیا۔ اردو زبان کو یہاں جو سیاسی سرپرستی حاصل تھی وہ اس سے محروم کر دی گئی۔ بھوپال کے سیاسی، سماجی حالات میں انقلاب آ گیا اور اردو زبان کی ترقی سے متعلق دیگر معاملات و منصوبوں کی طرح اردو یونیورسٹی کے قیام سے متعلق ملّا رموزی کا یہ خواب اس وقت اگرچہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا لیکن ہندستان میں اردو یونیورسٹی کے قیام سے متعلق ملا رموزی کے ان مخلصانہ جذبہ وخیال کو نہ صرف ہمیشہ استحسان کی نظر سے دیکھا جاتا رہے گا بلکہ ان کی یہ تحریک ہمیں ان کی اردو دوستی اور گاندھی جی کے حق پسندانہ عمل سے ان کی وابستگی کو یاد دلاتی رہے گی۔

ادبی وتخلیقی سفر، تصنیفات وتالیفات کی مشمولات کا جائزہ

ملاّ رموزی کو مطالعے کا شوق بچپن سے تھا۔ ان کے استاد علامہ محوی صدیقی، ملاّ رموزی کی ذہانت سے واقف تھے لہٰذا وہ ملاّ رموزی کے اس طرح مجبور ہو کر تعلیم ترک کر دینے والی بات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے ملاّ رموزی کے والد کو رضامند کر کے 1914 میں انھیں مدرسہ الٰہیات، کانپور میں داخل کرا دیا جہاں تین سال قیام پذیر اور زیر تدریس رہ کر انھوں نے 1917 میں ''فاضل الٰہیات'' کی سند حاصل کی۔

مدرسہ الٰہیات کانپور میں ملاّ رموزی نے علامہ آزاد سبحانی، مولانا عبدالحلیم صدیقی، حسرت موہانی وغیرہ اساتذہ سے فیض حاصل کر کے مطالعے کے ساتھ مضامین لکھنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا اور مدرسہ الٰہیات، کانپور سے فارغ التحصیل ہو کر 1917 میں باقاعدہ طور پر اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے مضامین اور کالم غیر منقسم ہندستان کے سبھی اہم اخبارات اور رسائل میں شائع ہونے لگے۔

ملاّ رموزی نے جس وقت ادب کے میدان میں قدم رکھا اس وقت ہندستان سیاسی،

معاشی، اقتصادی ہر اعتبار سے انتہائی نازک دور سے گذر رہا تھا۔ انگریزی حکومت کے ظلم و جبر و استبداد کے سبب پوری قوم خوف و ہراس اور مایوسی و محرومی کا شکار تھی۔ ہندستانیوں کی تحریر و تقریر، اور ہر قسم کی نقل و حرکت پر سخت نظر رکھی جاتی تھی۔ ملک کی آزادی اور انسانی حقوق کی بحالی کے لیے آوازِ حق بلند کرنا قابلِ تعذیر جرم سمجھا جاتا تھا۔ ملّا رموزی قوم پرست محبِ وطن، حساس دل، ذہین نوجوان ادیب تھے۔ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع تھا۔ وہ ملک کی آزادی اور قوم کی اصلاح و عمل کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ اپنے دل میں رکھتے تھے۔ اسی جذبہ واحساس نے انھیں ادیب اور شاعر بنا دیا۔ حکومت کی سختیوں، ظلم وستم اور پریس ایکٹ سے بچنے کے لیے انھوں نے طنز و مزاح کا سہارا لیا اور ایک ایسا مخصوص ومنفرد وموثر ودلچسپ طرزِ اسلوب ''گلابی اردو'' ایجاد کیا کہ جس کے تحت ایک خاص پیرائے میں وہ سنجیدہ اور پیچیدہ قومی، ملّی، سیاسی، سماجی، معاملات و مسائل کو اس حسن خوبی سے پیش کردیتے تھے کہ پڑھنے والا سمجھ جاتا اور وہ خود انگریز حکومت یا پریس ایکٹ کی گرفت سے بھی محفوظ رہتے تھے۔

ملّا رموزی کی ''گلابی اردو'' نے اردو صحافت وادب میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ ہندوستان کے مختلف اخبارات کے مدیران ان سے فرمائش کرتے اور وہ کسی کو مایوس نہیں کرتے تھے۔

تصانیف:

لکھنا، پڑھنا، چھپنا ملّا رموزی کا محبوب مشغلہ بھی تھا اور ذریعۂ معاش ہونے کے سبب ان کی مجبوری بھی تھی۔ چنانچہ مختلف موضوعات پر انھوں نے 50 سے زیادہ کتابیں اور سیکڑوں مضامین، کالم، منظومات، غزلیات، خطوط، تبصرے، تجزیے تحریر کیے ہیں۔ ان کی تحریر کردہ مطبوعہ 30 کتب میں سے صرف 22 کتابیں ہی دستیاب ہیں۔ یہی حال مضامین، خطوط، کالموں اور شاعری کا بھی ہے کہ ان کا بہت سا ذخیرہ محفوظ نہ رہ سکا اور امتدادِ زمانہ یا دیمک کی نذر ہو گیا۔

22 مطبوعہ کتب اور رسائل کے صفحات اور اخبارات کے کالموں میں محفوظ تحریریں، منظومات، غزلیات، خطوط اور بڑی تعداد میں بعض غیر مطبوعہ تحریریں جنھیں ان کے صاحبزادگان شوکت رموزی مرحوم اور رفعت اقبال رموزی نے بڑے احتیاط سے محفوظ رکھا تھا۔ پروفیسر خالد

محمود نے اسے مرتب کر کے قومی اردو کونسل، نئی دہلی کے طباعتی پروجیکٹ اسکیم کے تحت ''کلیاتِ ملاّ رموزی'' کے نام سے پانچ جلدوں میں مع ایک مبسوط مقدمے کے شائع کر دیا ہے لیکن حال ہی میں دستیاب ان کی کئی غیر مطبوعہ تحریریں اور مختلف موضوعات پر کہا گیا کلام اتنی مقدار میں موجود ہے کہ انھیں ایک یا دو کتابوں میں ترتیب دے کر شائع کیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ بالا کلیات ملاّ رموزی (5 جلدوں) کے علاوہ ایک شعری مجموعہ ''نظریاتِ غزل'' حال ہی میں مرتب کر کے ملاّ رموزی کے صاحبزادے رفعت اقبال نے شائع کیا ہے۔ سیکڑوں صفحات پر مشتمل ان کی غیر مطبوعہ تحریروں کو یکجا کر لیا گیا ہے اور ان کے صاحبزادے رفعت رموزی ان کی اشاعت کے لیے کوشاں ہیں۔

تصانیف ملا رموزی:

مطبوعہ کتب

جو ملاّ رموزی کی زندگی میں طبع ہوئیں

1-	انتخاب گلابی اردو	1921
2-	مقالات گلابی اردو	1922
3-	مجموعہ گلابی اردو	1923
4-	خواتین انگورہ	1923
5-	نکات رموزی حصہ اول	1927
6-	نکات رموزی حصہ دوم وسوم	1928
7-	سوانح ملا رموزی	1928
8-	صبح لطافت	1930
9-	شادی	1930
10-	عورت ذات	1930
11-	لاٹھی اور بھینس	1931
12-	دیوان ملاّ رموزی	1932

13-	شفاخانہ	1932
14-	زندگی	1933
15-	ملّا رموزی	1935
16-	انتخاب گلابی اردو	1940
17-	مضامین رموزی	1940
18-	خطوط رموزی	1940
19-	جنگ	1945
20-	مشاہیر بھوپال	1946

درج ذیل کتابیں شائع تو ہوئیں تھیں لیکن دستیاب نہیں ہو سکیں

21-	مشاہیر انگورہ	1924
22-	تاریخ انگورہ	1924
23-	ارباب انگورہ	1924
24-	اقطاب انگورہ	1924
25-	زنان مشرق	1925
26-	اقطاب مشرق	1926
27-	زنان مصر	1926
28-	مشاہیر شرق	1926
29-	درس عبرت	1927
30-	مسافر خانہ	1927
31-	ڈاک خانہ	1928
32-	گلستان گلابی اردو	1929
33-	چمنستان ظرافت	1930
34-	شام لطافت	1930

35- ننھے میاں کی سوانح عمری 1930
36- حیات رموزی 1933
37- غازی اعظم

38- لوزان کانفرنس
39- پنجاب نامہ
40- ننھے میاں
41- عشق بازی
42- مسلم لیگ کا نظام داخلی
43- جواہر کے اصول و خواص
44- دیوان شعر و غزل
45- عورت کی اصلیت، فلسفۂ عشق
46- سیرت النساء
47- نفسیاتِ عشق
48- انتخاب مضامین

ملا رموزی کی وفات کے بعد شائع کی گئی کتابیں

49- گلابی شاعری 1957
50- گلابی اردو 2012
51- نظریاتِ غزل (مرتبہ رفعت رموزی) 2013
52- کلیات ملا رموزی 5 جلدیں (مرتب خالد محمود) 2013

نوٹ:- نمبر شمار 21 سے 29 تک اور نمبر شمار 47، یہ کتابیں توحیدی ملا رموزی کے نام سے چھپی تھیں۔

غیر مطبوعہ کتب

نثر

1- شرح کلام اکبر الہ آبادی
2- عورت ذات
3- لطائف وظرائف
4- اسرار وحقائق
5- نوادر بھوپال (سفرنامہ بھوپال)
6- مقالات جنگ زنگ
7- مکتوب رموزی (1)
8- مکتوب رموزی (2)
9- رموز ولطائف
10- میرا عشق
11- خطوط رموزی، جلد دوم
12- طویل العمر بھوپال
13- مشاہیر بھوپال، جلد دوم
14- رمز ولطیفہ، جلد اول
15- رمز ولطیفہ، جلد دوم
16- مضامین رموزی جلد دوم (17 مضامین)
17- حقائق ولطائف
18- شذرات جنگ
19- میں نے پھر تقریر کی
20- خطوط رموزی ایڈیٹر سلمہٗ کے نام
21- علامہ اقبال اور بھوپال

22- عورت اور مرد
23- دستور اساسی
24- اولیائے بھوپال
25- تحقیق اشیائے بھوپال
26- پھولوں کی ڈلیہ
27- مولانا حسرت موہانی

شاعری

1- لطائف (مزاحیہ نظموں کا دیوان)
2- جرمن توڑ (غزلیں)

جن اخبارات میں ملا رموزی لکھتے تھے ان میں سے چند یہ ہیں۔

1-	تنویر	پیشاور
2-	دبدبہ سکندری	رامپور
3-	خیام	لاہور
4-	بھیشم	لاہور
5-	ملاپ	دہلی
6-	پرتاپ	دہلی
7-	ارجن	دہلی
8-	سوراجیہ	دہلی
9-	انکشاف	لکھنؤ
10-	کانگریس	دہلی
11-	دستور	شیرکوٹ
12-	البرید	کانپور

13-	منصور	بجنور
14-	پنجاب	امرتسر
15-	وکیل	امرتسر
16-	مدینہ	بجنور
17-	سیاست	لاہور
18-	زمانہ	کلکتہ
19-	انگارہ	کلکتہ
20-	امن	بنگلور
21-	ندیم	بھوپال
22-	افکار	بھوپال
23-	خورشید	حیدرآباد
24-	بیباک	سہارنپور
25-	آزاد	رامپور
26-	ریاست	دہلی
27-	سرپنچ	لکھنؤ
28-	احسان	لاہور
29-	اسلام	بمبئی
30-	حقیقت	لاہور
31-	منشور	لاہور
32-	صداقت	بمبئی
33-	نئی روشنی	بمبئی
34-	جمہوریت	بمبئی
35-	ملاپ	لاہور

-36	پرچم	بھوپال
-37	ہمدرد	دہلی
-38	آزاد	بنارس
-39	مصور	بمبئی
-40	پارس	دہلی
-41	زمیندار	لاہور
-42	مشعل	بمبئی
-43	اپنادیش	دہلی
-44	پاسبان	بنگلور
-45	انقلاب	لاہور
-46	عصرجدید	کلکتہ
-47	کارزار	کلکتہ
-48	چونچ	کلکتہ
-49	جے ہند	دہلی
-50	اجمل	دہلی
-51	انصاری	دہلی
-52	چونچ	بمبئی
-53	افکار	کراچی
-54	الناظر	لکھنؤ
-55	آزاد	مدراس
-56	ساتھی	پٹنہ
-57	خلافت	بمبئی
-58	انقلاب	بمبئی

59-	آفتاب	بمبئی
60-	وکیل جدید	امرتسر
61-	تنویر	لکھنؤ
62-	صدق	لکھنؤ
63-	الجمعیۃ	دہلی
64-	جنگ	دہلی
65-	انجام	دہلی
66-	تیج	لاہور
67-	پیام	دہلی
68-	چترا	دہلی
69-	حریت	لاہور
70-	حسرت	دہلی
71-	رہبر دکن	حیدرآباد
72-	تازیانہ	لاہور
73-	ارمغان	دہلی
74-	ہمدرد	دہلی
75-	نئی دنیا	دہلی
76-	افکار	گیا
77-	آفتاب اردو	بنگلور
78-	کارواں	کلکتہ
79-	اعلان	بنگلور
80-	منزل	حیدرآباد
81-	اخبار خادم	بمبئی

-82	دیہاتی	ملتان
-83	چندن	دہلی
-84	سدرشن	دہرادون
-85	اخوت	لکھنؤ
-86	الخلیل	دہلی
-87	محیر عالم	مرادآباد
-88	خیبر	بمبئی
-89	صبح دکن	حیدرآباد
-90	ہمایوں	لاہور
-91	مست قلندر	لاہور
-92	زم زم	لاہور
-93	حقیقت	لکھنؤ
-94	اقبال	بمبئی
-95	بنگلور میل	بنگلور
-96	مسلمان	دہلی
-97	شیر رنگون	رنگون
-98	زمانہ	کانپور
-99	نگارخانہ	دہلی
-100	نئی زندگی	امرتسر
-101	عکاس	امرتسر
-102	ناظم	رامپور
-103	سیاست	کانپور
-104	فروث	دہلی

105-	آزاد	بنگلور
106-	الانصاف	شاہ گنج الہ آباد
107-	صدق جدید	دریاباد، بارہ بنکی
108-	امن	اکولہ
109-	سماج	بمبئی
110-	تیج	دہلی
111-	دیہاتی	امبالہ
112-	عندلیب	بمبئی

جن رسائل میں ملا رموزی لکھتے تھے ان میں سے چند یہ ہیں۔

1-	مستانہ جوگی	بمبئی
2-	کہکشاں	بمبئی
3-	آئینہ	بمبئی
4-	نگارستان	دہلی
5-	آفتاب	بنگلور
6-	حیات نو	حیدرآباد
7-	سرپنچ	بمبئی
8-	سلطان	بمبئی
9-	الاصلاح	بمبئی
10-	الہدیٰ	دہلی
11-	خیام	لاہور
12-	ہمدرد	لاہور
13-	ہمدرد	دہلی
14-	فانوس	بنگلور

15-	المخدوم	مدراس
16-	خاتون سرحد	پیشاور
17-	دلچسپ	بمبئی
18-	کامیاب	دہلی
19-	معیار	میرٹھ
20-	صبح امید	بمبئی
21-	علیگ	علی گڑھ
22-	ہماری آواز	پٹنہ
23-	جام نو	بنگلور
24-	جریدہ آزاد	رامپور
25-	سہاگ	لاہور
26-	بیسویں صدی	دہلی
27-	محشر خیال	دہلی
28-	چنگاری	دہلی
29-	مشہور	دہلی
30-	روزگار	رامپور
31-	چلمن	دہلی
32-	منشورات	مظفر نگر
33-	مسلمہ	جالندھر
34-	آج کل	دہلی
35-	حسرت	بمبئی
36-	آفتاب نسواں	بھوپال
37-	شمع	دہلی

38-	ادیب	پیشاور
39-	حور	لاہور
40-	ارمغان	دہلی
41-	حقیقت اسلام	دہلی
42-	تندرستی	جالندھر
43-	خاتون مشرق	دہلی
44-	برہان	دہلی
45-	آواز حق	بمبئی
46-	کلیم	دہلی
47-	نگار	بھوپال
48-	عکاس	لاہور
49-	نرالا	لاہور
50-	جمعیت	کانپور
51-	تازیانہ ریویو	لاہور
52-	فانوس	لاہور
53-	پاسبان	بنگلور
54-	الفاروق	کامٹی
55-	ہمدرد صحت	دہلی
56-	مشہور	دہلی
57-	جھلک	دہلی
58-	سالک	راول پنڈی
59-	جادہ	بھوپال
60-	چمنستان	دہلی

-61	شعلہ وشبنم	دہلی
-62	زبان	منگرول
-63	جامعہ	دہلی
-64	الحیات	کانپور
-65	نظام	کانپور
-66	پیشوا	دہلی
-67	آفتاب	بھوپال
-68	نونہال	لاہور
-69	عرفان	میرٹھ
-70	غالب	بمبئی
-71	داستان	لاہور
-72	آواز	بھوپال
-73	مخزن	لاہور
-74	صوفی	گجرات
-75	ساقی	دہلی
-76	عالمگیر	لاہور
-77	نیرنگ خیال	لاہور
-78	مست قلندر	لاہور
-79	پارس	لاہور
-80	ادیب	پیشاور
-81	سب رس	حیدرآباد
-82	اردو معلی	کانپور
-83	اجیت	دہلی

-84	نیا بھوپال	بھوپال
-85	تحصیل	علی گڑھ
-86	خضرِ راہ	لکھنؤ
-87	شہاب	لاہور
-88	صنعت و تجارت	لاہور
-89	انشاں	بھوپال
-90	حسنِ خیال	بھوپال
-91	سفینہ	بھوپال
-92	بیدار	بھوپال
-93	مرقع	لکھنؤ
-94	صداقت	بنگلور
-95	چندن	دہلی
-96	آوازِ حق	دہلی
-97	صدائے نسواں	دہلی
-98	مستورات	کانپور
-99	سچا	لاہور
-100	مسیحا	رامپور
-101	جدت	مرادآباد
-102	سماج	مرادآباد
-103	اخلاق	بھوپال
-104	اجمل	بمبئی
-105	جامِ نو	بنگلور
-106	برہان	اکولہ

107-	جہاں گیر	لاہور
108-	تماشہ	بجنور
109-	غنچہ	لاہور
110-	گیت	دہلی

تعارف تصانیف ملا رموزی:

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے ملا رموزی کثیر التصانیف مصنف تھے۔انھوں نے 50 سے زیادہ کتب تصنیف کی تھیں،جن میں سے صرف 30 کتابیں ہی اشاعت پذیر ہو سکیں اور فی الحال ان میں بھی صرف 22 مطبوعہ کتب ہی دستیاب ہیں جنھیں کلیات ملا رموزی کی شکل میں ڈاکٹر خالد محمود نے مرتب کر کے اور ایک مبسوط مقدمہ تحریر کر کے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی سے شائع کروا دیا ہے۔

ملا رموزی کی تحریر کردہ چند اہم دستیاب کتب کا مختصر تعارف یہاں پیش کیا جاتا ہے:

مقالات گلابی اردو:-

یہ ملا رموزی کے مضامین پر مشتمل پہلی مطبوعہ کتاب ہے جو کہ 1922 میں نقاش پریس،بدایوں سے شائع ہوئی تھی۔اس کتاب میں مختلف عصری موضوعات پر گلابی اردو میں لکھے گئے ملا رموزی کے وہ دلچسپ مضامین شامل ہیں جو کہ ملک کے اہم اخبارات ورسائل میں شائع ہوئے تھے اور جنھیں ادبی حلقوں میں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔

خواتین انگورہ:-

1923 میں مطبع ادبیہ لکھنؤ سے شائع ہونے والی اس کتاب میں ترکی خواتین کی بہادری اور کمالات سے متعلق مضامین شامل ہیں۔یہ مضامین اس لیے بھی لکھے گئے تھے تاکہ ہندستانی خواتین بھی ان سے متاثر ہو کر اپنے اندر مثبت تبدیلی پیدا کر سکیں۔

سوانح ملا رموزی:-

1928 میں محبوب پریس دہلی سے شائع ہونے والی اس کتاب میں سادہ طرز نگارش میں ملا رموزی کے سوانحی حالات کو دلچسپ انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔

لکاتِ رموزی حصہ اول:-

یہ کتاب لاہور پرنٹنگ پریس لاہور سے 1927 میں شائع ہوئی تھی جس میں ملّا رموزی کے سادہ اسلوب میں لکھے گئے مزاحیہ مضامین شامل ہیں۔

لکاتِ ملّا رموزی حصہ دوم دسوم: 1928 میں دارالاشاعت لاہور سے شائع ہونے والی اس کتاب میں مختلف عصری موضوعات سے متعلق مضامین شامل ہیں۔

صبح لطافت:-

1930 میں گیلانی الیکٹرک پریس لاہور سے شائع ہونے والی اس کتاب میں طنزیہ مزاحیہ مضامین شامل ہیں۔

شادی:-

یہ کتاب ملّا رموزی کے ان طنزیہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے جس میں دنیا کے مختلف ملکوں اور اقوام میں ہونے والی شادیوں اور ان کے رسم ورواج کو دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب 1930 میں گیلانی الیکٹرک پریس لاہور سے شائع ہوئی تھی۔

عورت ذات:-

یہ ملّا رموزی کی سب سے زیادہ مقبول کتاب ہے جس میں مختلف ملکوں، قوموں سے متعلق بیویوں کی نفسیات، عادات واطوار نیز مزاج وماحول کو نہایت دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس [illegible] لعے سے ملّا رموزی کے وسیع تر مشاہدے، مطالعے اور ان کی جزئیات نگاری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

یہ کتاب پہلی بار 1930 میں گیلانی الیکٹرانک پریس لاہور نے اور 1961 میں مشورہ بک ڈپو دہلی نے شائع کی تھی۔

لاٹھی اور بھینس:-

جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہے ملّا رموزی کی دلچسپ کتاب ہے جس میں انھوں نے انگریزی سامراج کے ظالمانہ برتاؤ پر طنزیہ انداز میں اپنے وطن پرستانہ خیالات کو کامیابی اور اثر انگیزی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

یہ کتاب پہلی بار 1931 میں گیلانی الیکٹرک پریس لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن علوی پریس بھوپال سے 1958 میں شائع ہوا۔

شفاخانہ:۔

1932 میں محبوب برقی پریس، دہلی سے شائع ہونے والی اس کتاب میں طنزیہ مزاحیہ مضامین کے علاوہ ملّا رموزی کے مخصوص طنزیہ مزاحیہ انداز میں لکھے گئے بعض دلچسپ سفرنامے بھی شامل ہیں۔

زندگی:۔

مخصوص موضوعات پر تحریر کردہ طنزیہ مزاحیہ مضامین پر مشتمل یہ کتاب 1933 میں اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی تھی۔

انتخاب گلابی اردو:

1940 میں سلطانی پریس، بمبئی سے شائع ہونے والی اس کتاب میں مخصوص طرز اسلوب گلابی اردو میں لکھے گئے ان طنزیہ، مزاحیہ، مضامین کا انتخاب شامل ہے جو کہ انگریز حکومت کے خلاف قلمبند کیے گئے تھے اور جن کی اشاعت ملک کے اہم اخبارات ورسائل میں عمل میں آ چکی تھی۔

خطوط رموزی:۔

1940 میں علوی پریس بھوپال سے شائع ہونے والے اس مجموعے میں ملّا رموزی کے تحریر کردہ خطوط اور بعض معاصرین کے لکھے ہوئے خطوط بھی شامل ہیں جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملّا رموزی ایک کامیاب خط نگار بھی تھے۔

جنگ:۔

یہ ملا رموزی کے طنزیہ مزاحیہ اصلاحی واخلاقی مضامین کا مجموعہ ہے جو کہ 1945 میں علوی پریس، بھوپال سے شائع ہوا تھا۔

مشاہیر بھوپال:۔

یہ کتابچہ 1946 میں سلطانی پریس، بمبئی سے شائع ہوا تھا جس میں ملا رموزی کے

تحریر کردہ محلے چھاؤنی میں رہنے والے مختلف پیشوں سے متعلق ناموراشخاص کے خاکے شامل ہیں۔اس کتاب کی خوبی اوراہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس میں بھوپال بلکہ ہندوستان کے معروف مجاہدِ آزادی اور ہندوستان کی جلاوطن حکومت کے پہلے وزیرِاعظم مولانا برکت اللہ بھوپالی کا خاکہ بھی شامل ہے۔

گلابی شاعری:۔

یہ ملارموزی کی طنزیہ،مزاحیہ،اصلاحی شاعری کا انتخاب ہے جوکہ ان کے انتقال کے بعد 1957 میں علوی پریس بھوپال سے شائع ہوا ہے۔

نظریاتِ غزل:۔

ملارموزی کے اس مختصر شعری مجموعے کو ان کے بیٹے رفعت رموزی نے مرتب کر کے 2013 میں شائع کیا ہے۔اس شعری مجموعے میں ملا صاحب کی 47 شعری تخلیقات کے ساتھ ان کا تحریر کردہ مقدمہ بعنوان ''نظریاتِ غزل'' بھی شامل ہے جس میں انھوں نے غزل کے فرسودہ اور پامال موضوعات پر طنز کرتے ہوئے اردو غزل میں حقیقی اور عصری موضوعات کو شامل کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

کلیاتِ ملارموزی:۔

ہزاروں صفحات اور پانچ ضخیم جلدوں پر مشتمل ملارموزی کی دستیاب کتب کی مشمولات کو پروفیسر خالد محمود نے کلیات کی شکل میں مرتب کر کے اور اس پر ایک وقیع اور مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے 2013 میں اہتمام سے شائع کیا ہے۔

ملارموزی کی پہلی تحریر:

ملارموزی نے دارالالٰہیات کانپور کے زمانۂ طالب علمی (1917) ہی میں مطالعے کے ساتھ ساتھ لکھنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ان کا تحریر کردہ پہلا مضمون سادہ طرزِ نگارش میں اخبار ''وکیل'' امرتسر (مدیر مولانا ابوالکلام آزاد) کے 24 رنومبر 1917 کے شمارے میں بعنوان: ''جمعیۃ الالٰہیین'' صفحہ 8 کالم 1 اور 2 پر شائع ہوا تھا۔ جمعیۃ الالٰہیین دراصل جامعہ الٰہیہ کانپور کے

قدیم طلبا کی علمی ،ادبی انجمن تھی ۔اس مضمون میں 'جمعیۃ الالٰہین' کے قیام کے اغراض ومقاصد اوراس کی اہمیت اور ضرورت سے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے ۔ملا رموزی ابتدا میں محمد صدیق غشی بھوپالی ،ملا توحیدی کے ناموں سے لکھتے تھے ملا رموزی انھوں نے بعد میں اختیار کیا تھا۔ چنانچہ مذکورہ بالا مضمون محمد صدیق غشی بھوپالی کے نام سے شائع ہوا ہے۔

ملا رموزی نے علمی ،ادبی صحافتی حلقوں میں جب اپنی منفرد تحریروں سے ایک واضح ادبی شناخت قائم کر لی تو لوگوں نے خصوصا ان اخبارات ورسائل کے مدیروں نے ان کے لیے حضو۔" ریف الہند" "ضیاء الملک" "موجد گلابی اردو اور" "موجد نکاتی اردو" کے القاب بھی لکھنا شروع کر دیے تھے ۔ ملا رموزی نے اپنی تحریروں میں گلابی اردو اور سادہ طرز اسلوب دونوں کو اختیار کیا لیکن جو وصف مشترک طور پر ان کی تحریروں میں نمایاں نظر آتا ہے وہ ان کی اصلیت نگاری یا حقیقت نگاری ہے کہ اہم مسئلہ یا موضوع ہی انھیں لکھنے پر آمادہ کرتا تھا۔

اپنی کتاب" شادی" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> "ملا رموزی مسلمانان ہند میں ایک مضمون نگار،انشا پرداز،ادیب،مصنف،اور تحریری مصلح یا ادبی لیڈر مشہور ہیں،اوران تمام ناموں کی ذمہ داری مصلحانہ اور واعظانہ ہے ۔اس لیے ضروری ہے کہ ایسا آدمی ہر اس چیز کو قوم کے سامنے پیش کردے جو اس کی نظر میں قوم کے فائدے کی چیز ہو..........اس لیے ملا رموزی نے اپنے مضامین میں کبھی غیر اصول مصنوعی اور نا قابل یقین کیفیت کو پیش نہیں کیا۔"

گلابی اردو میں لکھا گیا ملا رموزی کا پہلا مضمون:

ملا رموزی نے انگریز سامراج کے خلاف جو پہلا مضمون" گلابی اردو" میں لکھا تھا وہ رسالہ "کانگریس" دہلی 27 نومبر 1917 کے شمارے میں" گلابی اردو" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔جس میں انھوں نے عصری سیاسی حالات کے پیش نظر انگریز حکمرانوں کے جابرانہ عمل وسلوک کو اس طرح موضوع بنایا تھا کہ وہ اپنی بات بھی کہہ جائیں اور نافذ العمل پریس ایکٹ کی گرفت میں بھی نہ آئیں۔

ملا رموزی کے مذکورہ بالا پہلے سیاسی مضمون کے چند اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اگر چہ نازل ہوئی ہیں اوپر ہر ہندستانیوں کے بیماریاں تعداد کی کئی زیادہ بیچ ایک سال کے سبب سے نہ ہونے تعلیم عام اور ہتھیاروں جدید کے۔ پھر پوشیدہ رکھا وائسرائے ہند نے ان نقصانات کو جو واقع ہوئے اور سرحد کے افغانستان کے، پس البتہ تحقیق کہ سلسلہ بات اس کی کا اوپر اس جگہ کے ساتھ عصا دینے کے کائنات کا کیا ہم نے منہ طرف اس کے لائے ہم اور کہا اگر نہ دیکھنے بیچ روشنی دن کے پریشانی قیدیوں ہندکی، وائسرائے ....چشمۂ آفتاب اور ہندستانی اخباروں کا کیا گناہ، بیچ اگر چاہتا ہے تو اسے پریس ایکٹ ہند کے اندھا کر دے۔ اللہ تجھے اے دفتری اقتدار آفتاب سیاہ کے، کیونکہ ایک تو بادشاہ عجم سے شکایت کرتے ہیں کہ ہاتھ ظلم و نظر بندی کا اوپر رعیت ہند کے دراز کرتا تھا اور ممتحن یونیورسٹیوں کے پرچے سخت بناتے ہیں واسطے طلبہ ہند کے اور اخبارات برٹش انڈیا کے نہیں لکھتے کچھ اور خرابیوں انتظام دیسی ریاستوں کے کہ رعایا ان کی۔۔ دشوار ہو گیا حاصل کرنا ملازمت کا بیچ ان کے کیونکہ مہاتما گاندھی نے بیچ کتاب یوسف زلیخا کے لکھا ہے ....بھلائی اور وفاداری کرنا ساتھ انگریزوں کے ہووے ایسا جیسے برائی کرنا ساتھ ترکوں اور جرمنوں کے ۔ یہاں تک کہ باز آگئے مسٹر لائڈ جارج قبضہ کرنے سے قسطنطنیہ کے اوپر، اشارہ ہندو مسلم اتحاد کے، دراز کرے عمر اللہ ہماری اور ایڈیٹر صاحب کانگریس کی..........''

ملا رموزی نے پریس ایکٹ کی گرفت سے بچنے کے لیے 1917 سے 1925 تک گلابی اردو میں قومی سیاسی مسائل پر بے شمار مضامین لکھے اور انھیں مختلف اخبارات و رسائل میں شائع کرایا لیکن خلافت تحریک کی ناکامی اور پریس ایکٹ کے خاتمے کے بعد انھوں نے سادہ طرز نگارش میں مضامین اور کالم لکھنا شروع کیا اور پھر آخری عمر تک اسی طرز میں لکھتے رہے۔

ملا رموزی کی آخری تحریر:

ملا رموزی کا قلم سے رشتہ آخری عمر تک قائم رہا۔ اپنے انتقال سے چند روز قبل،

بستر مرگ پر انھوں نے ''آخری مضمون'' کے عنوان سے جو نامکمل تحریر قلمبند کی تھی وہ ان کے انتقال کے بعد رسالہ ''معیارادب'' جنوری 1952 کے شمارے میں ''ملا رموزی کا بیارنامہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ان کے اس آخری مضمون کے چند اقتباسات نذر قارئین ہیں جن میں اپنوں کی بے اعتنائی کی شکایت صاف جھلکتی نظر آتی ہے:

''آخری مضمون''

''عوام سے گذارش ہے کہ اس مضمون میں وہ ظرافت اور ہنسی مذاق کو تلاش نہ کریں کیونکہ یہ مضمون میں موت کے لمحات میں لکھ رہا ہوں جبکہ دن رات مارے شدید درد کے بول نہیں سکتا۔البتہ خدا جن لوگوں سے کام لیتا ہے ان پر تھوڑے سے وقفے کے زمانہ میں بھی کام پر مجبور کرتا ہے۔اس لیے اس مضمون میں صرف اپنی علالت کے وہ واقعات لکھتا ہوں جن سے پتہ چلے گا کہ ہندستان کے اندر پیدا ہونے والے سیاہ اور تاریک کھوپڑی کے باشندے اپنے قلمی اور علمی محسنوں کی امداد وخدمت سے جانور پن کی حد تک بے پرواہ رہتے ہیں۔اس لیے آنے والوں کو میں مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اپنی زندگی کو ترقی دینے کے سوا اگر قومی خدمت کے میدان میں لے آئے تو میری طرح ان کی اور ان کی اولاد کی زندگی تباہ ہوجائے گی ....اب ایک نکتہ اور سن لیجیے وہ یہ کہ اسلام نے رابطہ برادری اور باہمی استحکام کے لیے مریض کی عیادت اور خدمت کو خدمت مبارک قرار دیا۔ویسے بھی مریض کی خدمت و عیادت مفید وضروری ہے لیکن اس فرض کو بھوپال نے کس طرح ادا کیا....... ....بجز لیفٹیننٹ،کرنل عبدالشکور صاحب قریشی،نصیرالملک سلام الدین خان بہادر،محمد احمد صاحب انصاری،جج ہائی کورٹ ومشیر قانون حضرت نواب حمیداللہ خان بہادر کے کوئی آج پورے ایک سال کی علالت میں ایک دن کو بھی میری عیادت اور پرسش کو نہ آیا............لیکن زمانہ کی تبدیلی نے کچھ باوقار

اور ہمدرد مونس اور قدرداں بھی پیدا کیے ہیں.............. خدا ہزار سال کی عمر دے میرے ایک لکھ پتی ہندو سیٹھ اور اس کی اولاد کو کہ اس سیٹھ نے مجھے علاج کے لیے دو سو روپے نقد اور ساتھ ہی یہ معاہدہ کہ میرا نام ظاہر نہ ہو............ یہ ہلکا سا اخلاق اور علم پروری کا نمونہ ہے اس بھوپال کا جس کے باشندے وقت آنے پر مجھے ''چراغ بھوپال'' بھی کہتے ہیں۔''

گلابی اردو کا پس منظر اور اس کی وجہ تسمیہ:

ملا رموزی نے 1917 میں جس وقت مضمون نگاری اور کالم نویسی کے ذریعہ اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا اس وقت انگریز حکومت نے ہندستانی مجاہدین آزادی کی بڑھتی ہوئی کوششوں اور اپنے خلاف اٹھنے والی باغیانہ آوازوں کو دبانے کی غرض سے 'پریس ایکٹ' نافذ کر کے ہندستانیوں کے خلاف تادیبی کارروائیاں شروع کر دیں۔ ملا رموزی کا مشاہدہ اور مطالعہ وسیع تھا وہ سچے محب وطن اور قوم پرست انسان تھے۔ انھوں نے ہندستانیوں کے خلاف ہونے والے ظلم وتشدد کو نہ صرف دیکھا اور محسوس کیا بلکہ اس کے خلاف اپنے تئیں آواز احتجاج بلند کرنے کی خاطر قلم کا سہارا لیا اور ''پریس ایکٹ'' کی گرفت سے بچنے کی خاطر ایک ایسے طرز اسلوب کو ایجاد کیا جو گلابی اردو کہلایا جس میں انھوں نے اپنے مافی الضمیر کو اس طرح ظاہر کیا کہ اپنی بات ہندستانی عوام تک پہنچا دی جائے اور کوئی گرفت بھی نہ ہونے پائے۔ ملا رموزی کے ذرائع آمدنی محدود تھے اور گھر کے تمام افراد کی کفالت کی ذمے داری اُن پر تھی لہٰذا انھوں نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے عصری سیاسی، قومی اور سماجی معاملات ومسائل کو اپنی تحریروں کا موضوع بنا کر اخبارات میں شائع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک گیر شہرت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ملا رموزی نے جب لکھنا شروع کیا تو پوری دنیا پر جرمن کا خوف طاری تھا۔ بقول خود:

''.............اب جوان کے سامنے یہ چھوٹا سا ملا رموزی پیدا ہوا تو آنکھیں کھولتے ہی اس کے سامنے وہ افسردہ اور رلانے والا ماحول تھا جسے سیاسی اصطلاح میں ''ہنگامۂ دار وگیر'' کہتے ہیں یعنی جنگ فرنگ پس یہی وہ وقت تھا

جب دنیا جرمنی کی 75 میل والی توپ سے خوف زدہ ہوکر کانپ رہی تھی
تو ہندستانی کی تحریری دنیا پریس ایکٹ نام کے قانون کے مُنہ میں تھی،اس لیے
محال تھا کہ نہ کام کے آدمی حد ادب سے زیادہ ہمت اور حوصلے سے کام لیتے
،اس لیے تاؤ کھا کر ملا رموزی نے بھی ''گلابی اردو'' کے نام سے وہ طرز تحریر
اختیار کیا کہ اچھے اچھے مر گئے مگر نہ سمجھ سکے کہ یہ کیا ہے؟''

(ماخوذ: مقدمہ'زندگی'ص565 مشمولہ'کلیات ملا رموزی'جلد دوم مرتبہ خالد محمود)

ملا رموزی گلابی اردو کے موجد و خاتم تھے جس کے ذریعے انھوں نے قومی،سیاسی،ملکی اور بین الاقوامی ہر طرح کے مسائل پر بے باکی،جرأت مندی کے ساتھ پُر لطف مزاحیہ انداز میں سنجیدہ موضوعات پر اظہار خیال کر کے اردو زبان کو ایک نئے طرز اسلوب نگارش سے روشناس کیا۔'گلابی اردو' کی خوبی اس کے مخصوص طرز اظہار میں تھی۔یہ دراصل اسی طرز خاص کی نقل ہے جو کہ شاہ عبدالقادرؒ نے قرآن شریف کے ترجمے کے لیے اختیار کی تھی۔پریس ایکٹ سے بچنے اور عصر حاضر کے سنجیدہ مسائل کو پرلطف انداز میں تحریر کرنے کے لیے ملا رموزی نے اسی طرز خاص کو اختیار کر کے اسے'گلابی اردو' کا نام دیا۔ادبی،صحافتی اور سیاسی حلقوں میں ملا رموزی کے اسی مخصوص اسلوب یعنی گلابی اردو اور اس کے ذریعے بیان کردہ مسائل و معاملات و موضوعات کو بے حد پسند کیا گیا۔سارے ہندستان میں اسی طرز خاص کی دھوم مچ گئی۔ہندستان کے سبھی اردو اخبارات کے مدیران نے فرمائش کر کے اور معاوضہ ادا کر کے'گلابی اردو' کو اپنے اخبارات کی زینت بنایا جس سے ان کے اخبارات کی مقبولیت اور تعداد اشاعت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا اور ملا رموزی کو بھی ملک گیر شہرت حاصل ہوگئی۔بلکہ ان ملکوں تک پہنچ گئی جہاں اردو اخبارات پڑھے جاتے تھے دلچسپ طرز اسلوب اور عصری مسائل کی ترجمانی کے سبب اردو اخبارات کے قارئین کو ملا رموزی کی تحریروں کا انتظار رہتا تھا۔بمطابق'ادبی دنیا'لاہور:

''ملا رموزی کی گلابی اردو کے لیے اخبار''زمیندار'' کا لوگ اس بے چینی سے
انتظار کرتے تھے،جس بے چینی سے لوگ جنگ کی خبروں کا انتظار کرتے ہیں۔''

گلابی اردو اور کالم نگاری کے مقاصد سے متعلق ملا رموزی نے لکھا ہے:

''اس کا مقصد یہی ہے کہ آپ کو ہنسی ہنسی میں سیاست، مذہب، تہذیب وتمدن، اخلاق ومعاشرت اور ادب وقومیت کے باریک نکتے سمجھا دیے جائیں جن کا تعلق آپ کی روزمرہ زندگی سے ہے۔

لہٰذا ایسے حالات میں بعض نکتے ایسے بھی ملیں گے جن کے اندر مذاق اور دل لگی کے علاوہ انتہائی متانت وسنجیدگی اختیار کی جائے گی۔''

(مستقل کالم 'نکات' سے ماخوذ)

طنز ومزاح کا پیرایہ اور گلابی اردو اختیار کرنے کا ملّا رموزی کا ایک مقصد عوام وخواص کے مزاج وماحول میں لطف وانبساط پیدا کرنا بھی تھا۔ اس ضمن میں انھوں نے لکھا ہے:

''میرا مقصد تحریر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ قوم میں زوال وغلامی، غیر قومی علوم اور غیر قومی تربیت سے جو افلاس انگیز اور موت آور ذہنیت پیدا ہو گئی ہے ملازمت کی لعنت اثر زندگی اور اولاد کی کثرت سے جو مالی تباہی پھیلی پڑی ہے اور اس سے جو مزاجی خشکی اور دماغی پریشانی ہوئی ہے اس کا یہ مولویانہ اثر ملاحظہ ہو کہ ہندستانی لوگ اپنی تفریحی مجالس اور تفریحی تقاریب میں بھی اتنے گاڑھے اور موٹے واللہ، چنانچہ بنے رہتے ہیں گویا فی قہقہہ انھیں دس سال کی سزا دے دی جائے گی، اگر وہ اپنی تفریحی محفل میں کہیں ہنس پڑے .... پس چاہتا ہوں کہ رونے والی قوم میرے ذخیرۂ تحریر سے زندہ دلی، خوش دماغی، ہنسی اور خوش طبعی کی امنگ اور مسرت اندوز زندگی کی بہاریں حاصل کرے اور نول کشور مطبع کے مولویوں نے جتنی کتابیں قیامت اور دوزخ کے عذابوں سے ڈرانے اور رُلانے کے لیے لکھی ہیں ان کے مقابل جنت کی بہاروں کا کوئی تحریری نمونہ بھی موجود رہے۔''

اپنے مخصوص شگفتہ طرزِ تحریر اور مقاصد ادب سے متعلق انھوں نے لکھا ہے:

''ملّا رموزی اپنی اس مقدرت پر کیوں نہ فخر کرے کہ اس کے قلم کو خدا نے ''نوحۂ زندگی'' اور کسی مولوی کے ''قیامت نامہ'' ہونے سے نہ فقط بچالیا بلکہ

اس کے قلم کو خدائے عالم آفریں نے حسن قبول سے یوں مزین فرمایا کہ وہ انسانوں کے ستائے انسانوں کو "غم افسردگی" یاس وناامیدی اور درد واذیت سے بچا کر سرور وشادمانی، مسرت وزندہ دلی کے ولولے سے معمور کر کے انھیں عرصۂ حیات وعمل میں پھر خوش خوش لے آئے۔اس قسم کے قلم ودماغ والے ملا رموزی نے جب مشق سخن کا سلسلہ شروع کیا تو یہ وہ وقت تھا جب زبان اردو میں لطیف تحریریں خواجہ غریب نواز کے عرس والے "پلاؤ" کی طرح تبرک سمجھی جاتی تھیں۔یعنی اردو میں ہنسانے والے کم تھے اور رلانے والے زیادہ جو ہنسانے والے تھے بھی تو وہ "قحط الظرفا" کے باعث خود کو کچھ اس درجہ بھی عالی شان اور عالی مقام بنائے ہوئے تھے کہ ان کی ایک ایک سطر عوام وخواص میں غفراں مکاں حکیم اجمل صاحب کے "مجربات" سمجھے جاتے تھے اور لوگ ان تحریروں کو اپنے خواجہ حسن نظامی کے تعویذ کی طرح گلے میں لٹکائے پھرتے تھے۔" (ماخوذ:مقدمہ زندگی)

جرمنی کی جنگ کے خطرے کے بعد جب تحریک آزادی ہند اور خلافت تحریک کا زور شروع ہوا تو ملا رموزی نے ان دونوں تحریکات کی موافقت میں اپنے قومی، ملی، سیاسی، وطنی افکار وخیالات کو اپنے مخصوص طرز اسلوب "گلابی اردو" میں پیش کر کے ہندستان کے سبھی اردو اخبارات میں شائع کیا اور اردو طنز وظرافت میں اپنے لیے ایک منفرد واہم مقام بنالیا۔

"گلابی اردو" دراصل نئے انداز کا وہ اسلوب ہے جسے مولوی حضرات کے قرآن مجید کے ترجمے کی نقل کہا جاسکتا ہے۔ملا رموزی نے اس قدیم طرز میں ایک نیا اسلوب اور نئی معنویت پیدا کی ہے۔انھوں نے اس طرز خاص کے ذریعے آثار سلف کو نہ صرف برقرار رکھنے کی سعی کی بلکہ علم النفس کے اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ملک وقوم کے سیاسی، سماجی، مسائل ومعاملات کو بغرض اصلاح، طنز وظرافت کے پیرائے میں بیان کر کے اسے اس قدر مقبول بنادیا ہے کہ ملا رموزی اور گلابی اردو ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت اختیار کر گئے۔گلابی اردو میں ظاہری اور باطنی، صوری اور معنوی خوبیاں پنہاں ہیں۔اگر ظاہری طور پر یہ طرز خاص لطافت وشگفتگی کا حامل ہے تو باطنی طور پر عرفان وبصیرت اور فکر وآگہی کے گہرے نقوش ونکات بھی اس میں پوشیدہ ہیں۔

ملّا رموزی نے گلابی اردو میں عربی فارسی لفظیات، مصطلحات، اشعار، ضرب الامثال اوراقوال کے ذریعے اردو تراجم کو اپنے اجتہاد اور تصرف سے جو ندرت، معنویت اور شگفتگی پیدا کی اس نے ادبیات اردو میں ''زعفران زار'' کی حیثیت اختیار کرلی۔ عوام وخواص ان کے مداح بن گئے۔ معاصرین نے بھی ان کے نفس مضمون اور طرز اسلوب کو خوب خوب سراہا۔ اس کا احساس خود ملّا رموزی کو بھی تھا۔ چنانچہ اس کے متعلق وہ رقم طراز ہیں:

''یہ طرز تحریر میرا سب سے پہلا طرز تحریر ہے جس کے ذریعے میں ملک میں روشناس ہوا ہوں اور میرے قدرداں بھائیوں اور بہنوں میں ایسے بے شمار بہن بھائی موجود ہیں جو میرے اس طرز تحریر کو پسند کرتے ہیں۔''

(ماخوذ: کتاب شفاخانہ از ملّا رموزی ص9)

ملّا رموزی کی ایجاد کردہ 'گلابی اردو' اور ملّا رموزی سے متعلق غیر منقسم ہندوستان کے تمام اہم اخبارات اور نامور ادیبوں نے اظہار رائے کیا ہے جن کے مطالعے سے ملّا رموزی کی اہمیت اور قدر وقیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چند آرا پیش کی جاتی ہیں:

مصور فطرت خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں:

''یہ روش اس قابل ہے کہ اس کو قائم رکھا جائے، پڑھا جائے اور اس میں سیاست ومعاشرت کے اہم مسائل کو لکھا جائے۔''

مولانا آزاد سبحانی رقم طراز ہیں:

''گلابی اردو مذہب وملت کے سوا سیاسیات میں نکتہ چینی اور اصلاح کا قابل تعریف طریقہ ہے۔''

مولانا اسلم جے راجپوری کا خیال ہے:

''میں نے ملّا رموزی کے سنجیدہ اور متین مضامین پڑھے ہیں۔ ''گلابی اردو'' بھی دیکھی ہے۔ ان سے میری رائے ان کی اردو نویسی کی نسبت بہت اچھی قائم ہوئی۔ یعنی ان کو قلم پر بے اختیار قدرت حاصل ہے۔ روانی اور سلاست کے ساتھ ہی عبارت صحیح اور فصیح ہوتی ہے کہیں کہیں لطافت وظرافت بھی

نظر آتی ہے۔''

پروفیسر عبدالقادر سروری نے ان کے ادبی مرتبے کے متعلق لکھا ہے:

''ملاّ رموزی میں ادب کی فراوانی اتنی زیادہ ہے کہ ایک بھی ہم عصر کو حاصل نہیں۔ دوسری چیز غور وفکر اور خیال کی پرواز اس درجہ بلند اور موزوں ہے کہ ان کی تحقیق اور فکر ہر نتیجہ حیرت انگیز اور مخاطب کو ششدر بنا دینے والا ہوا کرتا ہے ،مثلاً گلابی اُردو میں جب وہ خالص موضوعات پر لکھتے تھے تو ان کی بین الاقوامی معلومات اس درجہ مستند اور بلند ہوتی تھیں کہ اردو کے پختہ کار اخبار نویسوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ سیاسیات میں جو معرکہ خیز نکتے ملا رموزی بیان کر جاتے تھے دوسرے کے بس کی بات نہیں۔''

ایڈیٹر'نگار' نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

''ملاّ رموزی ملک کے اُن نوجوانوں میں ہیں جن کے اندر ترقی کی ہر اہلیت موجود ہے لیکن افسوس کہ نامساعد حالات کی بنا پر اُن کی قوتیں ضائع ہو رہی ہیں اور اس ناقدری کا اُنھوں نے کہیں کہیں اشارہ بھی کیا ہے''۔

(نگار، مارچ 1925)

مفتی کفایت اللہ کی رائے حسب ذیل ہے:

''میں نے آپ کے مضامین پڑھے آپ کا طرز سلیس، زبان شستہ، انداز دلکش اور دل پسند ہے۔ جودتِ فکر، جدوجہدِ استخراج کا پتہ دیتے ہیں اور ہر جملہ سے حبِ وطن اور شوقِ آزادی کی دلآویز خوشبو آتی ہے۔ میں نے آپ کی گلابی اُردو کے بعض مضامین بھی پڑھے ہیں جو اُردو زبان کے دورِ قدیم کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پیش کرتے ہیں''۔

مدیر'خلافت' مولانا شوکت علی نے ملاّ رموزی سے متعلق اپنے اخبار میں لکھا تھا:

''برسوں سے ملاّ رموزی، ملاّ رموزی کا چرچا تھا، اخبارات میں اُن کی گلابی اُردو کی دھوم تھی۔ لوگ مزے لے لے کر اُن کے مضامین پڑھتے تھے۔ چونکہ

میں شعریت اور ادبیت سے معرّیٰ تھا، میں سمجھتا تھا کہ یہ بھی کوئی نازک دماغ بزرگ ہوں گے۔ ملنے کا اشتیاق تھا...... چند ماہ ہوئے میں بھوپال ایک روز کے لیے گیا، حیات کے یہاں حسبِ معمول مہمان تھا، شعیب اور خلیق کے ساتھ راحت منزل گیا جہاں اُسی شام کو گوہر تاج ولی عہد بھوپال و بیگم صاحبہ نواب صاحب کوروائی کے صاحب زادہ کا عقیقہ تھا۔ میں بھی اُس رسم میں شریک ہوا۔
اِس رسم سے فارغ ہونے کے بعد میں جانے کے لیے کھڑا تھا کہ اِتنے میں حیات اور شعیب نے ایک صاحب سے ملاقات کرائی اور کہا کہ یہ ملّا رموزی صاحب ہیں۔ سب کو یہ سُن کر تعجب ہُوا کہ میں اب تک اُن سے نہ مل سکا تھا۔ چہرے سے نہایت مخلص اور سادہ مزاج انسان معلوم ہوتے تھے۔ ملّائیت کے آثار تھے نہ رموزیت نمایاں تھی۔ ایک سیدھے سادے مسلمان معلوم ہوتے تھے۔ سادی سی شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ دُبلے پتلے انسان بظاہر یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک کامیاب ادیب اور اِتنے مشہور لطافت نگار ہو نگے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں اِسی رات کو ڈاک سے بمبئی واپس جارہا ہوں تو اسٹیشن پر رخصت کرنے کے لیے آنے کا وعدہ کیا۔
رات کو جب میں حیات کے ہمراہ اسٹیشن پہنچا تو ملّا رموزی موجود تھے اور راستے میں دل بہلانے کے لیے اپنی دو تصانیف بھی پیش کیں۔ ایک میں کچھ میری سی شاعری تھی مگر مضمون میرے دل کو عزیز تھا۔ کالج کے نوجوان طلبا اور مسلمان نوجوانوں کی فیشن پرستی اور نسائیت پر انھوں نے گُل افشانیاں کی تھیں۔ غرض کہ مردانہ طرزِ زندگی سے جو تنفّر جدید نسل کو پیدا ہوتا جارہا ہے اس پر خوب لعن طعن کی تھی۔ اس باب میں میرے ان کے خیالات بالکل یکساں تھے..... رات کے بارہ بج گئے اور میں 'لاٹھی اور بھینس' کے نکات سے بہرہ اندوز ہوتا رہا۔ جب کتاب ختم کرلی تو سویا، رات کو خواب میں کبھی بھینس سامنے آتی تھی، کبھی ملّا صاحب کے خالو میاں مع اپنی منطق آرائیوں کے موجود ہوتے

تھے........ملاّ رموزی کی عنایتوں نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔انھوں نے جب سے 'خلافت' میں مضمون لکھنے کا وعدہ کیا تھا اس کو انھوں نے اس طرح پورا کیا کہ کوئی پرچہ 'خلافت' اُن کے دلچسپ مضامین سے خالی نہیں ہوا۔جب موقع ملے گا بھوپال جا کر زبانی بھی اُن کے اِس احسان کا شکریہ ادا کروں گا اور بہت سی دُعائیں دوں گا"۔

اُمرااور رؤسا کی رائیں

مُلاّ رموزی کی تحریروں کو عوام وخواص سبھی پسند کرتے تھے۔یہاں ملاّ رموزی سے متعلق اُمراورؤسا کی چند آراپیش کی جاتی ہیں:

منجانب اعلیٰ حضرت آقائے منیع الملک سفیر مختار شہنشاہ ایران

(سفارت خانہ ایران بمبئی،حکومتِ عالیہ ایران،3رشہر شوال 1342ھ)

بخدمت۔

جناب فضائل مآب آقائے ملاّ رموزی، توحیدی مدظلہ العالی، مصنف ''خواتینِ انگورہ''

فدایت شوم

یک نسخہ از کتاب ''خواتین انگورہ'' کہ از اثر خامہ آن دانش مند اسلام دوست می بود از نظر گزرانیدہ زحمات وکوشش آں جناب فضائل مآب در جمع آوری مطالب مندرجہ در نسخہ مذکورہ بے اندازہ قابل تقدیر وتحسین کشیدہ ایدامید است کہ این رشتہ مرضیہ را از دست ندادہ واز تالیفات وتصنیفات این قسم مطالب مفید عموم مسلماناں راہمیشہ مستفیض بفرمایند۔''

منیع الملک

عالی جناب راجہ راجگان ہزاکسی لینسی مہاراجہ یمین الملک سرکشن پرشاد بہادر
صدر اعظم حیدرآباد دکن

حیدرآباد دکن 23/اگست 1934

بخدمت جناب ملا رموزی صاحب مکرمی تسلیم

عالی جناب راجہ راجہ یان مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت پیش کار و صدر اعظم دولت آصفیہ دام اقبالہٗ نے آپ کی متعدد تصانیف ملاحظہ فرمانے کے بعد مجھے ہدایت فرمائی ہے کہ میں اس امر کا اظہار کروں کہ سرکار دام اقبالہٗ آپ کی انشا پردازی کی قدر فرماتے ہیں۔ نیز ارشاد ہوا ہے کہ سرکار کی جانب آپ کے پاس سونے کی دستی گھڑی بطور تحفہ روانہ کی جائے۔ جو ذریعہ ہٰذا مرسل خدمت ہے۔ براہِ کرم وصول سے ایما فرمایا جائے تو مناسب ہے۔

پرائیویٹ سکریٹری

اعلیٰ حضرت قدر قدرت حضور ہزہائینس نواب میر علی نواز خاں صاحب بہادر فرماں روائے
ریاست خیر پور

بخدمت مولانا توحیدی صاحب

کیمپ شاہی خیر پور سندھ
5/جون 1924

آپ کا مضمون در بارۂ ریاست خیر پور کی ترقیاں مطبوعہ ''اودھ اخبار'' لکھنؤ، مؤرخہ 25/مئی 1924 حضور انور کی سماعت میں لایا گیا۔ جس پر حضور معلیٰ نے بے حد اظہار پسندیدگی فرمایا۔

دستخط (پرائیویٹ سکریٹری،
دربار خیر پور)

نیاز علی خان اسد نے ملا رموزی اور ان کی گلابی اردو کے تئیں خراج تحسین اس طرح پیش کیا۔

رنگ کیا کیا یہ دکھاتی ہے گلابی اردو | واہ کیا دل کو لبھاتی ہے گلابی اردو
ہے بجا اس کو اگر خضرِ زمانہ کہیے | راہ گم کردہ دکھاتی ہے گلابی اردو
اہلِ بینش سے کہو آکے وہ بھر لیں دامن | دُرّ و گوہر کو لٹاتی ہے گلابی اردو
معجزہ کیوں نہ کہوں رنگ بیاں کو تیرے | خامشی، وجد میں آتی ہے گلابی اردو

شوق ہے ملاّ رموزی سے اسد ملنے کا
دم بہ دم جس کو بڑھاتی ہے گلابی اردو

نمونہ گلابی اردو:

''امابعد اے محترم مفت کی کتابیں پڑھنے والو!

کیا مگر اچک لے گیا شیطان راندا ہوا عقلوں درجہ سوم تمھاری کی، یا نہ رہی غیرت بیچ دلوں سیاہ تمھارے کے کہ پڑھتے ہو کتابیں تم مانگ کر دوستوں بھی محلے والوں سے، مگر نہیں شرماتے تم: پس قسم ہے اس بے شرمی تمھاری کی کہ گالیاں دیتا ہے تم کو پیچھے تمھارے وہ شخص کہ مانگ کر لاتے تم کتاب جس سے، پس اگر باقی ہے بیچ دل و دماغ تمھارے کے حرارت، اے گرمئی غیرت کی تو خود خرید کر پڑھا کرو تم کتابیں موافق پسند اپنی کے کیونکہ البتہ تحقیق ہے یہ کام برا، پس دور ہو تم اس سے اور جو نہیں سکتے ہو یا نہیں سکتی ہو تم خریدنا، مبلغ کتاب کا بہ سبب افلاس اپنے کے تو صبر ہی بہتر ہے واسطے تمھارے کیونکہ نہیں ہے اور البتہ تحقیق نہیں ہے، ضروری یہ کہ فروخت کی جائے غیرت بدلے کسی کتاب کے جیسی کہ فروخت ہو رہی ہے غیرت اور حیا ہندستانیوں کی ذریعہ سے نئے تمدن اور نئی تہذیب کے۔ پس کیا نہ دیکھا تم نے اے شاگرد نیک بخت کہ چلتی ہیں اور اوپر سڑکوں ٹھنڈی کے ہندستان زادیاں اٹھا کر سینہ اپنا ساتھ طریقوں یورپ کے مگر یہ بے خبر ہیں وہ رسوائی اپنی سے، مگر اے عجب ماں باپ ایسی مسماتوں کے............ پس اگر ہو تم رکھنے والے عقلِ سلیم اور مذاقِ علمی کے

تو خریدار پہنچاؤ ہم کو اس کتاب کے ساتھ کثرت زیادہ کے تادن حشر کے نجات
پاؤتم تعزیرات ہند اور پریس ایکٹ سے بھی، مخمل موتیوں کے ملیس تم کو بھی،
.........کہ جب لطف اٹھاتے ہو تم کتاب سے ملاّ رموزی کی تو لطف پہنچاؤ تم
خریداروں زیادہ سے ملا رموزی اپنے کے کو۔''

گلابی اردو دراصل ایک دلچسپ پیرایۂ اظہار تھا جو کہ خلافتِ تحریک اور تحریکِ آزادیٔ ہند کی حمایت میں اور پریس ایکٹ کی گرفت سے بچنے کے لیے اختیار کیا گیا تھا۔ چنانچہ جب خلافت تحریک کا جوش ٹھنڈا ہو گیا اور پریس ایکٹ ہٹالیا گیا تو ملا رموزی نے گلابی اردو کے بجائے سادہ طرز نگارش میں عصری مسائل کو موضوع بنانا شروع کر دیا۔ بعض ناقدین کا خیال تھا کہ ملاّ رموزی کی تحریروں کی دلچسپی اور ان کی شہرت محض گلابی اردو کے باعث ہے۔ لہٰذا ناقدین کو اپنی اس رائے پر نظر ثانی کرانے کے لیے انھوں نے سادہ اور سلیس طرز اسلوب اختیار کیا اور 1925 کے بعد تادمِ آخر اسی انداز میں زندگی اور سماج کے مختلف النوع موضوعات پر اظہار خیال کر کے نہ صرف قارئین کی توجہ مبذول کراتے رہے بلکہ انھیں اپنا ہم نوا اور ہم خیال بھی بناتے رہے۔

گلابی اردو کی شگفتگی اور اس کے ترک کر دینے کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے ملاّ رموزی نے لکھا ہے:

''گلابی اردو کی جانِ شگفتگی اصل میں وہ سیاسی تنقید اور نکتہ چینی ہوا کرتی تھی جو اس وقت اس تحریک کا حقیقی نصب العین تھی مگر یہ نصب العین تابع تھا، مسلمانانِ ہند کے اس عظیم الشان اور متفقہ مقصد کا جو منصب خلافت۔ کے حفظ و بقا کے لیے آٹھ کروڑ مسلمانان ہند نے طے کیا تھا.........میں بقائے خلافت کی جنگ میں اس لیے شریک ہوا تھا کہ اپنے قلم کی بہترین قوتوں کی اس جنگ کے مجاہد سپاہیوں کی کمانڈ میں خرچ کروں گا اور اسی لیے ''گلابی اردو'' میں 1921 تک جو ولولہ انگیز شوخیاں پائی گئیں وہ اصل میں ان ہی خلافتی لشکریوں کی تازگی اور حوصلہ افزائی کے لیے تھیں............لیکن جب 1922 میں ہماری بدنصیبی سے تخت خلافت

کوتر کی مسلمانوں نے اٹھا دیا اور مسلمانوں کا کوئی مرکز نہ رہا تو گلابی اُردو لکھنے والا قلم جس حسرت اور افسردگی سے رکھ دیا گیا۔ اسے کچھ دل ہی خوب جانتا ہے ۔اور واقعی آج جو قلم گلابی اردو بہ طرز یادگار لکھ رہا ہے وہ قلم نہیں ہے جس سے کبھی جوش خدمت اور ولولہ انگیزی کی چنگاریاں بلند ہوا کرتی تھیں۔"

(از "نکات رموزی" حصہ دوم ص16-15)

بہر حال گلابی اردو اختیار اور ترک کرنے کے اسباب جو بھی ہوں یہ حقیقت ہے کہ ملاّ رموزی ایک کامیاب ادیب تھے ان کی سادہ طرز نگارش بھی اسی قدر بامعنی اور بلیغ ہے جس قدر کہ گلابی اردو! اسے بھی اسی قدر دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا تھا جس قدر کے گلابی اردو کو پڑھا جاتا تھا۔ ملاّ رموزی کی سادہ طرز اسلوب کا حامل اقتباس بعنوان "زنانہ" بطور نمونہ ملاحظہ کیجیے۔

"ہندستان میں عورت ایسی لطیف اور جان دار چیز کے خطاب کے لیے جو اسماء، اشارات یا ضمیریں وضع کی گئی ہیں، ان میں صوبہ جات متحدہ کو سواری کہتے ہیں۔ طریق استعمال یہ ہے کہ "ذرا پردہ کیجیے سواریاں آتی ہیں"۔ دوسرا نام ہے "مستورات" خدا جانے یہ مستور کے معنی عورت اور مستورات کے معنی عورتیں کس مولوی فاضل نے وضع فرمائے ہیں۔ تیسرا نام ہے "ماں بہنیں" طریق استعمال یہ ہے:

"ہماری ماں بہنوں سے ایسی توقع تھی"۔ چوتھا نام ہے "بہو بیٹیاں"۔ پانچواں نام ہے "بی بی"۔ چھٹا نام ہے "نیک بخت" یہ نام صرف خاوند کے لیے مخصوص ہے اور وہ بھی اس وقت کے لیے جب وہ اپنی بیوی سے جنگ میں مغلوب ہو گیا ہو تو کہے گا، بس نیک بخت جانے بھی دے۔ ساتواں نام ہے "اماں" اور لطیف یہ ہے کہ اس نام کو بھی خاوند ہی زیادہ استعمال کرتا ہے، البتہ اس نام میں اولاد کا نام بھی ملا لیا جاتا ہے۔ مثلاً "چنو کی اماں" اور "بدھو کی ماں" اب آٹھواں نام کلیجہ تھام کر سن لیجیے اور وہ نام ہے "گھر کے لوگ" مثلاً خاوند کہے گا کہ میرے گھر کے لوگ کہتے ہیں کہ تم انگریزوں کے کپڑے کیوں استعمال

کرتے ہو! تو عوام کہیں گے سچ تو کہتے ہیں تمھارے گھر کے لوگ!.........ان ناموں کے بعد بیوی کے لیے "وہ" "ان" اور تم کی ضمیریں بھی کام میں لائی جاتی ہیں مثلاً: "وہ کہتی ہیں" وغیرہ

لیجیے یہ ہیں وہ اسمائے اشارات جن کے ساتھ عورت یا عورتیں مخاطب کی جاتی ہیں.........انھوں نے (انگریزوں نے) بھی ہماری عورتوں کا ایک نیا نام وضع کیا ہے، اور وہ نام ہے "زنانہ"۔ اب یقین نہ ہو تو دیکھ لو انگریزی ریلوں کے ہر تھرڈ کلاس ڈبے کی وہ تختی جس پر جلی حروف میں لکھا ہوتا ہے "زنانہ" مراد یہ ہے کہ اس ڈبے میں صرف عورتیں بیٹھ سکتی ہیں۔"

ملّا رموزی نے اپنے ملک کے داخلی معاملات و مسائل پر توجہ دینا شروع کی اور سادہ و سلیس انداز اختیار کیا تو اس کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا:

"اب جو ملّا رموزی نے ہندستانیوں کی یہ باہم آویزی دیکھی تو اس غریب نے سب کچھ چھوڑ کر ہندستانیوں کا "ہوم ڈپارٹمنٹ" سنبھال لیا اور طے کر لیا کہ ان غلامی کے مارے ہوؤں اور غلط تعلیم و تربیت کے ستائے ہوؤں کی اخلاقی اور داخلی اصلاح جب تک نہ ہوگی ان کے فرشتے بھی دنیا میں کامیاب نہ ہوں گے۔ اس لیے اب اس نے خطاب و کلام کا وہ طرز اختیار کیا جسے سلیس اور مروّجہ اردو کہتے ہیں۔ پس اس طرز کا پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ اب ملّا رموزی کی بات کو وہ گورنمنٹیے بھی سمجھنے لگے جو انگریزی تعلیم کی وجہ سے گلابی اردو کی عربی، فارسی مصطلحات کو اپنے والدین تک سے دریافت کرتے تھے مگر نہیں سمجھتے تھے کیونکہ آج کل کے والدین صاحب صرف انگریزیے ہوتے ہیں، عربیے اور سنسکرتیے نہیں۔"

بحیثیت مضمون نگار:

ملّا رموزی نے کالم نگاری اور مضمون نگاری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا اور اس ملک کے مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہونے کے سبب جلد ہی ملک گیر شہرت حاصل کر لی۔ ان کی

تحریریں خصوصی مقاصد کی حامل ہوتی تھیں جن میں ملکی اور بین الاقوامی اہم سیاسی، سماجی، تہذیبی حالات ومسائل کو موضوع بنا کر ایک خاص انداز میں اظہارِ خیال کیا جاتا تھا۔ ابتداءً ملاّ رموزی کو جو شہرت ومقبولیت اپنے وطن بھوپال سے باہر کے سیاسی صحافتی اور ادبی حلقوں میں حاصل ہوئی وہ بھوپال میں حاصل نہ ہوسکی۔ بھوپال کے دوسرے فن کاروں کی طرح یہ گلہ ملاّ رموزی کو بھی اپنے اہلِ وطن سے رہا۔ چنانچہ اپنی مضمون نگاری کے ابتدائی عہد میں ہی انھوں نے لکھا تھا:

''اب جیسے جیسے میرے مضامین کو ہر ہر گوشے میں مقبولیت حاصل ہونے لگی، ویسے ویسے مجھے اپنے وطن بھوپال کے تاریک غیر علمی اور بے ہوش ماحول کے احساس نے تباہ کرنا شروع کردیا۔ یعنی 1917 میں جب میں نے مضامین لکھنے کا آغاز کیا، ہندستان تو میرے اس طرزِ خصوصی پر تڑپ اٹھا مگر میرے وطن بھوپال میں کسی نے یہ تک محسوس نہ کیا کہ میں نے کیا تیر مارا۔ حتیٰ کہ گلابی اردو کے سیاست افروز مضامین کے زمانے میں بھی بھوپال میں ایک لکھے پڑھے مزدور سے زیادہ نہ سمجھا گیا۔ بات یہ تھی کہ بھوپال کے خزانے پر غیر بھوپالی مسلمانوں کا قبضہ تھا جو بھوپالیوں کے عوض اپنے ہم وطنوں کی فکر میں مبتلا رہتے تھے اور ان کا بھلا کرتے تھے............اب میرے مضامین کی شہرت و مقبولیت میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا جاتا تھا، ویسے ویسے میرے احساس و شعور میں بھی وسعت پیدا ہوتی جاتی تھی اور میں چاہتا تھا کہ کوئی مالی سرپرستی حاصل ہوتو ملک وقوم ومذہب کی خدمت زیادہ وسعت اور تکمیل سے انجام دوں...........اب اس عرصے میں مجھے ان لوگوں سے جوامداد ملی اوّل تو اس میں خود ان کی قدر دانی نہ تھی بلکہ یہ سرراس مسعود مرحوم اور مولانا شوکت علی مغفور کی سفارش کا اثر تھا.....بعض کے یہاں مجھے ملازم ہی کی حیثیت سے دیکھا گیا۔ اس لیے میرا یہ طنز ان کے لیے خاص ہے کہ ان سب نے میری جوامداد کی وہ مجھے غریب سمجھ کر، ادیب سمجھ کر نہیں!''

ملاّ رموزی کا پہلا مضمون بعنوان ''گلابی اردو'' رسالہ ''کانگریس'' دہلی میں دسمبر

1917 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ ابتداءً انھوں نے غشی اور ملا تو حیدی کے نام سے مضامین لکھے پھر ملا رموزی کا قلمی نام اختیار کر کے آخر تک اسی نام سے لکھتے رہے اور یہی قلمی نام ان کی شہرت اور شناخت کا سبب بن گیا۔ پریس ایکٹ کے نفاذ کے سبب 1917 سے 1924 تک وہ اپنے مخصوص اسلوب گلابی اردو میں مضامین لکھتے رہے اور 1924 کے بعد سادہ طرز میں مضامین لکھنے لگے لیکن جواثر انگیزی اور سحر کاری ان کی گلابی اردو میں تھی وہی ان کے سادہ طرز اسلوب میں بھی برقرار رہی اور ان کی شہرت اور مقبولیت میں کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوا۔

بحیثیت خط نگار:

ملا رموزی نے مضامین، خاکے، کالم، اور اکبرالہ آبادی کے منتخبہ کلام کی تشریحات کے علاوہ اپنے دوستوں، مداحوں اور اخبارات کے مدیران کے نام خطوط بھی بکثرت لکھے ہیں۔ ان خطوط میں بھی شوخی، ظرافت اور دلچسپ انداز سے کام لیا گیا ہے۔ ان کے یہ خطوط عام رسمی خطوط سے اس لیے مختلف ومنفرد ہیں کہ ان میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی معلومات شامل ہیں۔ ان خطوط کے مطالعے سے ملا رموزی کی مخصوص طرز تحریر، نئے نکات بیان کرنے وسیع المطالعہ ہونے اور بات میں بات پیدا کر کے مکالماتی انداز اختیار کرنے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

مکتوب بنام ایڈیٹر صاحب ''نگارستان'' دہلی میں لکھتے ہیں:

''محترم مدیر نگارستان دہلی!

بعد سلام مسنون آں کہ معلوم ہو کہ الحمدللہ تادم تحریر ہذا یہاں پر خیریت ہے اور خیر وعافیت اس محترم کی درگاہ خداوند کریم سے شب وروز نیک مطلوب۔

دیگر احوال یہ ہے کہ اس طرف موسم خراب ہو رہا ہے، یعنی مدت مدید وعرصہ بعید سے یہاں بارش نہیں ہوئی ہے، جس سے دن میں گرمی شدید ہوتی ہے اور ذی ہوش لوگوں کو تکلیف مزید۔

مذہب کو سائنس پر ترجیح دینے والے کہتے ہیں کہ نماز اور دعا سے بارش ہو سکتی ہے اور نیاز مند کا خیال ہے کہ جب تک مان سون پیدا نہ ہوگی مر بھی جایئے

تو بارش نہ ہوگی اور مان سون کا قرآن پاک میں بھی تذکرہ ہے۔ادھر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب انسان کے مظالم اور سیہ کاریاں ملک چین ،حبشہ، ہسپانیہ، البانیہ ،سلوا کیہ اور دینرگ تک پہنچ جاتی ہیں اور جمعیۃ الاقوام کا دوزخ ان کو جلاتا نہیں تو ایک بارش کیا جاڑا تک بند ہو جائے گا اور ہم آپ لحافوں اور روئی کے کپڑوں کی خرید کے عذاب سے بچ جائیں گے۔مگر ہاں سچ فرمایا آپ نے کہ آپ کو ان سیاسی باتوں سے کیا تعلق ،آپ تو ٹھہرے فلمی آدمی ،مگر اپنی تاریک خیالی سے سنیما سے کوئی دلچسپی نہیں لیتا............خیر تو دیگر احوال یہ ہے کہ خدا تندرستی دے بارش ہو یا نہ ہو مضمون نگاری اور عشق بازی کا سلسلہ بند نہیں ہوگا۔بس ڈر ہے تو قحط سالی کا کیونکہ قحط سالی میں عشق بازی کے خلاف سعدی علیہ الرحمۃ کی یہ دفعہ 144 نافذ ہو جاتی ہے کہ:

چناں قحط سالی شد اندر دمشق

کہ یاراں فراموش کردند عشق

مگر میری رائے میں یہ سوال ہے جغرافیادانی کا۔یعنی سعدی علیہ الرحمہ نے قحط سالی میں عشق بازی بند ہونے کا واقعہ دمشق کے متعلق لکھا ہے اور ہم آپ ہیں ہندستان میں اور ہندستان میں اللہ میاں کا دیا سب کچھ ہے،صرف عقل سلیم ہی نہیں ہے اسی لیے تو دیکھ لیجیے کہ ہر ہندستانی کے مصارف اس کی آمدنی سے دوچند ہی نظر آتے ہیں ۔اسی طرح ہندستان میں ہر کام وہ شخص کرتا ہے جو اس کام کا اہل نہیں ہوتا۔دور نہ جائیے ایڈیٹری ہی کا کام لے لیجیے کہ اس پختہ کارانہ کام کو بھی ہندستان کے ایسے نوخیز اور نوعمر لڑکے چلا رہے ہیں جو آٹھویں،نویں جماعت سے تعلیم چھوڑ کر بھاگ آئے ہیں اور بعض پرچوں کے ادھر نہ ادھر خالص چیف ایڈیٹر بنے ہوئے ہیں ۔ایسے نوخیز ایڈیٹروں کے ذریعہ زبان اردو میں جو گندہ ،حیاسوز، بےکار اور خلاف عقل وفطرت ذخیرہ جمع ہو رہا ہے اس پر آنے والی نسل کے پختہ کار محرم سے زیادہ روئیں گے۔مثلاً آپ آج کل کے

رسالوں کے افسانوں ہی کو لے لیجیے کہ لکھے تو جا رہے ہیں انبار در انبار مگر ہوتے ہیں سب غلط ،خلاف فطرت اور خلاف واقعہ ۔ایسے افسانوں میں جو جذبات، واردات اور واقعات دکھائے جاتے ہیں ان سے ہندستان کی معیاری شرافت، حیا اور خود داری پر جو ضرب لگ رہی ہے اور یہاں کے باوقار حسن کی جیسی تحقیر ہو رہی ہے، یہ غریب لوعمرے افسانہ نگار کیا جانیں کہ ایسے گندہ، فحش اور دوراز حقیقت افسانوں سے ہندستانی حسن کے وقار کو صدمہ پہنچ رہا ہے........

دیگر احوال یہ ہے کہ میں تماشہ کرنے والی لڑکیوں سے اتنا ہی واقف ہوں کہ وہ خوب صورت اور فیشنی ہوتی ہیں ۔البتہ ان کے نماز روزہ کی عادت سے واقف نہیں، کیونکہ وہ مجھ سے اور میں ان سے دور ۔ممکن ہے کہ بعض ان میں مذہبی ہوں اور غیر مذہبی۔ پھر بھی سینما میں تماشہ کرنے والی لڑکیوں اور لڑکوں سے ملک کو یہ نقصان پہنچ رہا ہے کہ یہ دونوں غیر ہندستانی لباس وغیرہ ہندستانی اشیائے آرائش سے ملکی وضع قطع کو بگاڑ رہے ہیں۔

بھئی اگر یہ سینمائی لڑکیاں لونڈر کے عوض اپنے لکھنوی اصغر علی محمد علی صاحبان کی دکان کا عطر استعمال فرمائیں تو اس طرح ملکی صنعت کو ترقی ہوگی۔

غرض ہر چیز میں جب تک ''ملکی پن'' اور قومی پن کا لحاظ نہ رکھا جائے گا اس وقت تک میں اور میری چھوٹی بیوی نہ سینما کا تماشہ دیکھیں گے نہ سینما پر کچھ لکھ سکیں گے۔

اب تو یہ فرمایئے کہ آپ کی طرف کا موسم کیسا ہے؟ میرا تو خیال ہے کہ ہندستان چونکہ بے ہنری اور افلاس کا گھر ہے اس لیے اس میں بارش کے زمانہ میں بھی اگر خاک ہی اڑتی رہے تو تعجب نہ کیجیے۔ بھلا بے ہنری سی بے ہنری ہے کہ لاکھوں نوجوان لڑکے محض بے ہنری کی وجہ سے بیویوں سے محروم ہیں اور لاکھوں لڑکیاں ہیں جو بے ہنری کی وجہ سے اچھے شوہروں سے خالی۔''

(کلیات ملا رموزی جلد سوم ص613-616 مرتبہ خالد محمود)

وطن دوستی قوم پرستی اور ملکی مسائل کے تئیں فکرمندی ملا رموزی کی تحریروں کا ایسا خاص وصف تھا جس کا اظہار وہ طرح طرح سے کر کے قارئین اور ملکی رہنماؤں کی توجہ مبذول کراتے رہتے تھے۔

بحیثیت شاعر:

بحیثیت طنز و مزاح نگار، کالم نویس اور ''موجد گلابی اردو'' ملا رموزی کو اردو ادب میں نمایاں شہرت اور مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ شہر غزل بھوپال میں شاعری خصوصاً غزل کا چرچہ عام تھا۔ ملا رموزی نے اسی شاعرانہ ماحول سے متاثر ہو کر علامہ محوی صدیقی کو استاذ بنا کر 1934 میں باقاعدہ طور پر رموزی تخلص اختیار کر کے شاعری کا آغاز کیا اور نظم کے بجائے غزل کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ لیکن مروجہ رومانی اور روایتی عشقیہ غزل کے موضوعات کے بجائے سیاسی، سماجی، قومی، ملی اور اصلاحی موضوعات غزل میں پیش کیے۔ غزل کی عام مصطلحات اور لفظیات سے اجتناب کر کے اسے حقیقی زندگی اور فطری معاملات و مسائل کا ترجمان بنایا۔ ان کی نثری تحریروں کی طرح شاعری میں بھی ملا رموزی کی شخصیت فکر و خیال اور ان کے عہد کے حالات کا عکس صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں فکری اور نظریاتی اعتبار سے وہ اکبرالہ آبادی کے قریب تر نظر آتے ہیں لیکن معیار، ''تہہ داری'' معنویت اثر آفرینی اور لطف انگیزی کے اعتبار سے وہ اکبرالہ آبادی سے آگے نہ بڑھ سکے البتہ انھوں نے کلام میں اپنی بات اپنے انداز سے کہنے کی سعی کی اور بعض نئے نکات بھی پیدا کیے۔ کیونکہ اکبرالہ آبادی کی طرح ملا رموزی کا مطمح نظر مقصدی اور اصلاحی تھا اس لیے ان کے کلام میں اخلاقی، فلسفیانہ اور اصلاحی انداز نمایاں ہے جس میں کہیں کہیں مزاح کی چاشنی کے ساتھ اکثر جگہ طنز کی نشتریت محسوس کی جاسکتی ہے۔

ملا رموزی کی ذاتی ڈائری میں نقل کلام کے مطابق ان کی پہلی غزل کے چند اشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں۔

سکوں پہ اب کہیں دل کا نظام آیا ہے
مری طرف بھی جو گردش میں جام آیا ہے

ستم کہ مجھ سا ترا قدرداں زمانے میں
ترے نہیں ترے قاصد کے کام آیا ہے
مرے پیام پہ قاصد سے آج تک میں نے
نہیں سنا کہ ترا بھی پیام آیا ہے
تمام عمر تری یاد میں رموزی کو
یہ فخر ہے کہ ترا اک سلام آیا ہے

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے ملا رموزی ادب کی مقصدیت کے قائل فن کار تھے۔ وہ ادب سے ذہنی تفریح کے ساتھ ساتھ اصلاح وعمل کا کام لینا چاہتے تھے چنانچہ نثر وشعر دونوں سے انھوں نے یہی کام لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں اور کلام دونوں میں اصلیت اور واقعیت نمایاں نظر آتی ہے۔ غزل کی ایرانی روایت اور اس کے فرسودہ انداز کو وہ پسند نہیں کرتے تھے جس میں کہ غیر حقیقی یا غیر فطری جذبات وخیالات کو پیش کیا جاتا تھا۔ ملا رموزی نے غزل جیسی عشقیہ، رومانی صنف کو زندگی کے حقیقی مسائل کا ترجمان بنانے کی نہ صرف کوشش کی بلکہ عملاً بھی اس کی کامیاب مثالیں پیش کی ہیں۔ غزل کے روایتی موضوعات، مصطلحات اور لفظیات کو نہ صرف اپنی غزل سے خارج کر دیا بلکہ دوسروں کو بھی اس کا مشورہ دیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے باقاعدہ طور پر کئی مضامین لکھے ان کے ایک مضمون (بعنوان: کلام رموزی کی خصوصیات مطبوعہ ''ندیم'' بھوپال، 26رجنوری 1937) کو ایڈیٹر ندیم نے اپنے اس نوٹ کے ساتھ شائع کیا تھا:

> ''اس ادبی مضمون کو بھی ملا صاحب کی مخصوص مزاحیہ اسپرٹ کی متابعت کرتے ہوئے پڑھیے، پڑھتے پڑھتے ذرا سنجیدہ ہو جائیے اور دیکھیے کہ تغزل کے پامال راستہ سے یہ ظریف اور بذلہ سنج شاعر کس طرح خوبی، سلاست اور لطف بیان کے ساتھ ہٹ رہا ہے۔'' (ایڈیٹر)

ملا رموزی نے روایتی اردو غزل میں ترمیم واصلاح کر کے اپنی غزلوں کو جن نئی اور مفید باتوں سے آراستہ کیا ہے ان کے متعلق انھوں نے اپنے مستقل کالم ''اشارات ولطائف'' کے تحت کلام رموزی کی خصوصیات مطبوعہ' ندیم' بھوپال، 26رجنوری 1937 میں اپنے خیالات

کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''برادر محترم محمود الحسن صدیقی صاحب، مدیر و دبیر، جریدہ ''ندیم'' نے اپنے ادب آگاہ ذوق کے اثر سے مجھ سے فرمائش کی کہ میں ان کے پرچہ میں اپنا منظوم ذخیرہ خیال بھی پیش کروں۔ چونکہ میری شعر گوئی ایک تجدیدی مقصد واصلاح کی محرک ہے اس لیے بطریق تعارف چند اصول پیش کرتا ہوں جن کے بغیر میری غزل سے استفادہ غیر ممکن ہے۔

میں نے شاعری کی تمام اصناف واقسام کو چھوڑ کر صرف غزل کو اختیار کیا ہے لہٰذا میرے اعتراضات کو غزل تک ہی محدود رکھیے۔

میں نے اندازہ کیا ہے کہ انسانی دماغ کی بلندیوں اور ترقیوں کا یہ وہ زریں اور تابناک زمانہ ہے جبکہ انسان نے ہوائی جہاز، ہوائی تار، بحری جہاز اور بحری تار کے ذریعہ غیر محسوس فضاؤں اور طاقتوں کو مسخر کرلیا ہے لیکن اتنے بلند، روشن، ترقی طلب اور اصلاح پسند زمانہ میں غزل کے اصول وہی ہیں جو حدود ایران میں کسی غیر عقلی وغیر فطری سے عہد میں وضع ہوئے تھے۔ پس غزل گوئی کے ایرانی اصول اگر اس تابناک عہد میں کسی شاعر کے گھر میں بند رہتے تو مجھے اعتراض نہ تھا لیکن دنیا کو علم ہے کہ ان اصول سے کہی ہوئی اردو کی غزل کو کروڑوں انسان پڑھتے ہیں اور اس کے بیان کردہ تاثرات سے متاثر بھی ہوتے ہیں، لہٰذا جس کلام وخطاب سے کروڑوں انسان متاثر ہوتے ہوں، اس کلام وخطاب کو بہت کافی طور پر اسی زمانہ کے حالات وواقعات اور ضروریات کے مطابق ہونا چاہیے جیسا کہ اردو میں بعض نظمیں، اس زمانے کی ضروریات کے مطابق کہی گئی ہیں۔ لیکن بدقسمتی یا جہل وبے خبری کے باعث اردو غزل میں آج تک کوئی ترمیم نہیں ہوئی اس لیے میں نے غزل سے ذیل کے یکسر خلاف عقل وفطرت اصول وامور کو نکال باہر کردیا ہے:

1- مثلاً غزل میں رقیب کا کردار قوم میں غیر خود دارانہ بے حیائی اور بے شری

پھیلانے والا کردار ہے، اس لیے خارج۔

2- محبوب کا یہ عمل شریفانہ، توہین کرنے والا اور خلاف واقعہ ہے کہ وہ اپنے عاشق کو بھری محفل سے کان پکڑ کر یا ذلیل کر کے نکال باہر کردے نیز بھری محفل میں محبوب سے چھیڑ چھاڑ، اس شائستہ عہد میں غیر مہذب عمل ہے جو سوقیانہ انداز کو سامنے لاتا ہے، اس لیے خارج۔

3- محبوب کے حسن کو دیکھ کر فطری طور پر ایک دل خوش کن اور روح بخش اثر تو پڑ سکتا ہے لیکن یہ سراسر غلط ہے کہ محبوب کو دیکھتے ہی آپ پاگل ہو جائیں اور شہر چھوڑ کر جنگلوں میں گھاس چرتے پھریں، اس لیے غزل سے پاگل اور جنگل بھی خارج۔

4- محبوب کی قدرے بے رخی اور بے پروا مزاجی تو صحیح مگر محال ہے کہ وہ آپ کے شریفانہ جذبۂ محبت کے مقابل آپ کو قتل و جراحت کی سزا دے، اس لیے غزل سے مقتل، مجروح اور بسمل کا کردار بھی خارج۔

5- شاعر اور عاشق اگر انسان ہیں تو کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ طوطا، مینا اور فاختہ بن کر صیاد کے دام اور پنجرے میں پھنس کر پابند ہو کر رہ جائے اور اوپر سے باتیں اور فریادیں بھی کرتا ہے........لہٰذا خارج۔

6- شاعر یا عاشق اگر کسی تعلیم یافتہ انسان کا نام ہے تو وہ کس طرح قبر میں سے ایک زندہ انسان یا اس کی زندہ لڑکی سے گفتگو کر سکتا ہے لہٰذا غزل سے قبرستانی عشق بھی خارج۔''

ملا رموزی نے مذکورہ بالا مضمون میں روایتی غزل کے جن مروجہ غیر فطری موضوعات کو اپنی غزل سے خارج کر دیا تھا ان میں بیمار، بیماری اور تیمارداری کا کردار، محبوب کے لیے بے وفا، ستم گر، قاتل، بدخو، بدعہد، ظالم جیسے خطابات اور الزامات اردو غزل میں اکثر استعمال ہوتے ہیں۔ ملا رموزی نے اپنی غزل سے اس نوع کے خلاف عقل و فطرت خطابات بھی خارج کر دیے تھے۔ انھوں نے غزل سے پند و نصیحت کے اشعار، حشر کا منظر، اور عاشق کے لیے استعمال ہونے

والے حقیر، فقیر، کم ترین، خادم جیسے الفاظ کو بھی اپنی غزل سے نکال باہر کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنے اس مضمون کے آخر میں لکھا ہے کہ:

''مجھے اطمینان ہے کہ میری غزل کے مضامین، واقعات، صحیح حسن وشوق کے آئینہ دار ہیں......... میری یہ ترمیم صرف غزل تک محدود ہے.......... اسی میں ہر عہد کے حالات کے موافق ترمیم کی جا سکتی ہے پھر میری ترمیم صرف ان کے لیے ہے جن کے دل ودماغ میں جوانی کی بجلیاں ہیں، ان سے کوئی تعلق نہیں جو بوڑھی متانت کے ضعف میں مبتلا ہو چکے ہیں، وہ چاہیں تو غزل کے عوض مرثیہ ہی سے دل بہلائیں۔''

ملا رموزی فطری شاعر تھے۔ انھوں نے نثر نگاری کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کے ذریعہ بھی اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے لیکن بحیثیت طنزیہ مزاحیہ شاعر وہ کوئی امتیازی شان یا انفرادی پہچان قائم نہیں کر سکے۔ جو شہرت اور مقبولیت انھیں بحیثیت نثر نگار خصوصاً موجد گلابی اردو حاصل ہوئی وہ بحیثیت شاعر حاصل نہ ہو سکی۔ البتہ ان کی شاعری ان کی نثر نگاری کی طرح اُن کے افکار وخیالات اور ذہانت وفطانت کی ترجمان ہے جس میں ان کے عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی مسائل ومعاملات کی جھلکیاں صاف طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ سنجیدہ، حقیقی، قومی، ملی، مسائل کی ترجمانی کے سبب ان کے اشعار، قاری یا سامع کے دلوں کو چھوتے ہیں اور متعلقہ موضوعات کی اہمیت کو واضح کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ملا رموزی نے عمر کے آخری حصے میں شاعری کی جانب توجہ مبذول کی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ محض 32 صفحات پر ان کی زندگی میں شائع ہوا تھا، پھر ان کی وفات کے بعد دوسرا شعری مجموعہ 1957 میں ''گلابی شاعری'' کے عنوان سے اور تیسرا شعری مجموعہ ''نظریات غزلیات'' 2013 میں شائع ہوا ہے۔

نثر کی طرح شاعری میں بھی ملا رموزی نے ایک خاص طرز اختیار کیا تھا۔ اکبرالہ آبادی کی طرز پر انھوں نے بھی نامساعد حالات اور سیاسی سماجی مسائل کے حل کی خاطر آواز احتجاج بلند

کی ہے لیکن شاعری میں انھیں وہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی جو کہ اکبرالہ آبادی کے حصے میں آئی۔ ملا رموزی کے مخاطب خواص سے زیادہ عوام تھے لہٰذا انھوں نے انہی مسائل کو موضوع بنایا اور ویسا ہی اسلوب اختیار کیا جو کہ عوام الناس کے قریب تر تھا۔ ملا رموزی کی شاعری کا مقصد بھی سماج کے دبے کچلے عام انسانوں کی اصلاح اور ترقی تھا۔ چنانچہ اسی مقصد خاص کے حصول کے لیے وہ شعر کے پردے میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار طنزیہ طور پر ایک خاص انداز سے کرتے رہے۔ ملا رموزی نے اپنے کلام کی لفظیات، مصطلحات، محاورات کے استعمال میں بھی اس بات کو ملحوظ رکھا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

ڈنڈ پیلتا ہے اور پہنتا ہے بوسکی
گویا بذات خود ہی سرمایہ دار ہے
صاحب کی پیش کاری کے نخرے سے آج کل
موٹی ہوئی ہے آپ کی جو کھال دیکھیے

ملکی اور سیاسی امور کے اظہار میں بھی ملّا رموزی نے اسی طرز خاص کو ملحوظ رکھا ہے۔ دیکھیے یہ اشعار:

چارپائی تک مسولینی کی چرانے لگی
پٹخنی یونان سے یوں کھا گیا البانیہ
اٹلی اور یونان کے دنگل کے طفیل
غیب سے برٹش کا اک جنگی النگا چل گیا
پھنس گئے ہیں یوروپی تبلیغ کے پھندوں میں یہ
اور ہر پھندے کے اندر عالمانہ چال ہے

ملّا رموزی نے صلہ وستائش کی تمنا سے بے نیاز ہوکر بحیثیت ادیب وشاعر اپنا انسانی فریضہ ادا کیا ہے ان کا یہ شعر ان کی طرز فکر کا عکاس ہے:

واں شعر پہ ملتے ہیں خطاباتِ حکومت
یاں شعر بھی لکھتے ہیں تو ہم خونِ جگر سے

ملا رموزی مشرقی قدروں کے ہمنوا اور مغربی قدروں اور فیشن پرستی کے سخت خلاف تھے۔ وہ قوم کے نوجوانوں خصوصاً طلبا میں مشرقی تہذیب اور ہندستانیت کو رچا بسا دیکھنا چاہتے تھے۔ان کے اشعار میں یہ احساس اور تردد،قومی درد بن کر اس طرح بار بار ابھرتا ہے:

اس عہد کے جوان ہیں دوشیزہ، نازنیں
آرائشوں سے رہتے ہیں ہر روز مہ جبیں

رہے غلام ہی ہندوستان کے سارے سپوت
ہزار سوٹ سے ان کو سجا کے دیکھ لیا

اس شوق لباس مغرب سے برباد ہوئی دولت تیری
فیشن تو نہیں تھا حسن ترا، سیرت تھی، تری زینت تیری

بی اے کا جب سے زور ہوا ہے تو دیکھیے
اگلا سا اب خدا ہے نہ اب رام رام ہے

دبک رہا ہوں رقیبوں سے اس لیے اب تک
کہ مجھ کو پہلا سبق آر اے ٹی ریٹ ملا

ملا رموزی اعلیٰ تعلیم کے مخالف نہیں تھے لیکن ایسی تعلیم جس سے خود اپنی شناخت، خودداری اور غیرت ختم ہو جائے اس کے وہ سخت خلاف تھے اور اس کی مخالفت میں انھوں نے بذریعہ اشعار آواز احتجاج بلند کی ہے۔

ملا رموزی انسان دوستی اور باہمی اتحاد و اتفاق کو ملک وقوم کے لیے فال نیک سمجھتے تھے۔فرقہ واریت،تعصب ان کے نزدیک سم قاتل تھا لہٰذا وہ انسانی عظمت اور حب الوطنی کے پیغام کو عام کرنے کی سعی کرتے رہے۔اور اپنے ہم وطنوں کو اس طرح متنبہ بھی کرتے رہے۔

وہاں تو قبضۂ حبشہ بھی ہوگیا کامل
یہاں ہے ہندو مسلماں کی ہائے ہو اب تک

زمانے بھر میں بس ایک ملک ہند میں دیکھی
یہ جنگ مندری اور جنگِ مسجدی میں نے

اذانِ مسجد اور ناقوسِ مندر
ان آوازوں پہ ظالم کٹ رہے ہیں

سبھا اور انجمن کے نام ہی سے
یہ ٹکڑے ٹکڑے بٹ رہے ہیں

ملّا رموزی کا طنزیہ کلام اپنے عصری حالات سے ہم آہنگ ہے۔ سادگی، پرکاری، اور معنویت ان کے کلام کی ایسی خصوصیات ہیں جو انھیں دیگر طنز و مزاح شعرا سے ممتاز کرتی ہیں۔

ملّا رموزی کا خیال تھا کہ کسی صحت مند معاشرے کی خوش حالی اور ترقی کے لیے خواتین کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے وہ تعلیم نسواں کے حامی تھے لیکن ایسی تعلیم کے قائل نہ تھے جس کے حصول سے معاشرے میں ابتری، بے راہ روی اور زوال پیدا ہوتا ہو۔ جدید تعلیم کے مُضر اثرات سے بچنے کے لیے انھوں نے کہا تھا ۔

تعلیم جس کا نام ہے، تعلیم ہی نہیں
پھر کیسے ہوں گی ہند میں بیدار عورتیں

اردو شاعری میں عورتوں کو نازک اندام و نازک مزاج بنا کر پیش کیا گیا ہے انھیں محض محفل کی زینت اور حسن کی مورت سمجھا جاتا ہے۔ ملا رموزی خواتین کے تئیں قائم کردہ اس عام تصور سے متفق نہیں تھے، وہ عورتوں کو بھی مردوں کے دوش بدوش باعمل دیکھنا چاہتے تھے۔ اس بات کا اظہار انھوں نے اپنے کلام میں بار بار کیا ہے۔ ذیل کے اشعار بھی انھی خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

عورت کو شاعروں نے نازک بنادیا ہے
جنت کا پھول ہونا باور کرادیا ہے
موجِ شراب ہے وہ جانِ جناب ہے وہ
اس کے دماغ میں یہ نقشہ جمادیا ہے
تشبیہ دے کے اس کو حور و پری و گل سے
دلہن سے کچھ سوا ہی اس کو سجا دیا ہے
خطرہ کے وہم تک سے اب وہ لرز رہی ہے
نازک بنا کے اس کو اتنا ڈرا دیا ہے
کہہ کہہ کے اس کو نازک کہہ کہہ کے اس کو رنگیں
ہمت کا اس کی ہر اک جوہر مٹادیا ہے
ریشم کی ساڑھیوں سے مخمل کی چپلوں سے
نو عمر لڑکیوں میں جادو جگادیا ہے
اب حسن و نازکی کے عریاں مقابلوں میں
پریاں بنا بنا کے ان کو بٹھادیا ہے

کلام ملا رموزی کا ایک نمایاں وصف انگریزی الفاظ کا برمحل استعمال کر کے ایک مخصوص معنویت پیدا کرنا ہے۔ اردو میں اکبرالہ آبادی نے اس وصف خاص سے، خاص کام لیا ہے۔ ملا رموزی نے بھی طنز کی دھار کو تیز تر کرنے یا مزاح پیدا کرنے کی خاطر اس حربے کو استعمال کیا ہے اور خوب استعمال کیا ہے۔ اس امر کا جواز پیش کرتے ہوئے انھوں نے اپنے غیر مطبوعہ دیوان کے مقدمے میں لکھا ہے:

''میں اردو میں بے ضرورت انگریزی الفاظ کا مخالف ہوں مگر اس مجموعے میں جو انگریزی الفاظ لایا ہوں وہ یا تو ایسے ہیں جن کا رد و بدل انگریزی الفاظ کے مقابلہ بہت کم سمجھا جاتا ہے یا پھر محض ظرافت کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جیسا کہ مشہور ہے۔

مقطع میں آپڑی ہیں انگریزی بندشیں
واللہ ان سے کوئی لگاوٹ نہیں مجھے

انگریزی الفاظ کے برمحل استعمال سے متعلق کلام ملا رموزی کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

حسن جو ٹیمپریری تھا، عشق بھی آن ریری تھا
اس نے مجھے بھلادیا ، میں نے اسے بھلادیا

ملنے کی ہو امید تو سرکاری لسٹ سے
ثابت کروں رقیبوں سے میں خود کو سینئر

خط بھیجتا ہوں اس کو میں اب شارٹ ہینڈ میں
یعنی ہو داستانِ محبت بھی مختصر

مجھے تو عشق میں انگلش کے ایٹی کیٹ کے ساتھ
حقیقتوں سے بچا کر مجاز دے دیجیے

فرانس کو تو ملا ملک شام تک قبضہ
غریب ہند کو لندن کا ایٹی کیٹ ملا

اسمبلی سے بھی منوا سکوں میں عشق کا حق
گورنری کے وہ کچھ بائی لاز دیدیجیے

ملا رموزی نے ہندستان کی جنگ آزادی اور عالمی جنگوں اور ان کی تباہ کاریوں کو اپنی تجربہ کار آنکھوں سے نہ صرف دیکھا اور دردمند دل سے محسوس کیا بلکہ ان کے انسانیت سوز اثرات کو اپنی تحریروں اور شاعری میں بھی ایک خاص انداز میں ڈھال کر ملکی اور بین الاقوامی سیاست کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

نظم نُما غزل بعنوان: 'ہٹلر کا جواب ملا رموزی کے نام' میں ہٹلر کی جابرانہ فطرت اور ہندستانیوں کی بے عملی اور بے حسی پر اس طرح طنز کیا گیا ہے۔

میرے بزرگ و محترم و صاحب ہنر
ہندوستاں کے مرشد و ہادی و راہبر
جو واقعات ہند بتائے ہیں آپ نے
میں لفظ لفظ ان کو سمجھتا ہوں معتبر
میرے مطالبات غلط تو ضرور ہیں
لیکن جو پھنس گیا ہوں تو کرتا ہوں شور و شر
اب اس کا تو علاج نہیں میرے پاس بھی
یاں بم گراؤں اور ہلیں واں کے بام ودر
ہندوستاں کی آب وہوا ہی جو پست ہو
پیدا ہو اس میں کیسے دماغ بلند تر
ہندوستاں کو پہلے محقق بنایئے
پھر فرقہ بندیوں کا مٹے گا یہ شور و شر
فیشن سے آگے ان کی کوئی زندگی نہیں
پیدا ہو اس سے ان میں عقل کے کیسے نکتہ ور
ایسا نصاب علم ہو ہندوستان کا
جو دے سکے دماغ کو تدبیر تاجور
حملہ کروں نہ میں کبھی ہندوستان پر
کہہ دیجیے کانگریس سے بس قصہ مختصر

ملا رموزی عالمی سیاست کی انسان دشمن پالیسیوں پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔انھوں نے محض ہٹلر کو ہی اپنے طنز کا نشانہ نہیں بنایا بلکہ روس کے حکمراں اسٹالن کی آمرانہ اور توسیع پسندانہ پالیسیوں پر بھی کاری ضرب لگائی ہے۔ان کے یہ اشعار ان کی اسی طرز فکر کی ترجمانی کرتے ہیں ۔

مزدور کا لیڈر ہے یہ روس کا ڈکٹیٹر
یا دوسرا ہٹلر ہے، یہ روس کا ڈکٹیٹر
ہٹلر کا تو ہر فتنہ اک فتنۂ ظاہر ہے
خاموش سااک شر ہے، یہ روس کا ڈکٹیٹر
ہے پیٹ میں گنجائش بلقان کے بھرنے کی
دبلا سا اک اژدر ہے یہ روس کا ڈکٹیٹر

ہٹلر اور اسٹالن کے علاوہ روسی وزیر اعظم مولوٹوف بھی ملا رموزی کے طنز سے محفوظ نہیں رہ پاتے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ اور ترکی حکومت سے متعلق مولوٹوف کی تقریر سن کر ملا رموزی کا ردعمل اس طرح ظاہر ہوتا ہے:

مسئلہ پولینڈ کا جب حل نہ ہٹلر سے ہوا
تب چمک اٹھی ذرا تقریر مولوٹوف کی
اب چلے ہیں دندناتے آپ بلقاں کی طرف
ہونہ جائے ترک سے تحقیر مولوٹوف کی
دیکھتا تھا گری تقریر اور کہتا تھا میں
پھوٹنے والی ہے اب نکسیر مولوٹوف کی
آپ سن لیں گے کہ وہ ترکوں میں دلیا ہوگئی
جو پکی تھی ماسکو میں کھیر مولوٹوف کی

ملا رموزی ہندستانی عوام خصوصاً نوجوانوں کو ملکی آزادی کے تئیں باعمل، بیدار اور مستعد بنانا چاہتے تھے۔ ہندستان کو غلامی سے آزاد کرانے اور بین الاقوامی سیاست میں اہم کردار نبھانے کی خاطر وہ اپنے کلام سے بیداری عمل کا کام انجام دیتے رہے۔ ان کی نثر نگاری کی طرح ان کی شاعری نے بھی مقصدی اور اصلاحی کردار ادا کیا ہے۔

ملا رموزی نے اپنی شاعری خصوصاً غزل گوئی کو لایعنی، پامال اور روایتی عشقیہ موضوعات سے بچا کر اس میں عصری قومی اور اخلاقی موضوعات شامل کر کے مقصدی، افادی اور

اصلاحی بنا کر اس میں حقیقی رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی غزل میں نہ تو نامراد، بے وفا، بے حس، معشوق دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی گوشہ نشینی، صحرا نوردی اور جنوں خیزی کے فرضی یا خیالی مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ وہ اپنی غزل میں جذبے سے زیادہ عقل پر زور دیتے ہیں۔ مثلاً ۔

کمال عقل غزل کے لیے ضروری ہے
نہیں تو ہو کے رہے گی غزل ہمیشہ تباہ
سنا غزل میں کبھی آسماں کی باتیں بھی
اور اتنی اونچی ہی اس کی کوئی زمین بنا
وہاں تو شعر سے قومیں جوان ہوتی ہیں
یہاں کی ساری غزل آہ اور فغاں تک ہے
وہاں تو کھل بھی گئی رنگ و بو کی فیکٹری
یہاں غزل ہی میں ہے بحث رنگ و بواب تک
نظر ہے پست تو محبوب تک سے عشق میں بھی
برابری کو یہ شاعر سمجھ رہے ہیں گناہ
دماغ عرش نظر ہو تو فکر عالی ہو
نکالیں تب یہ محبت میں باوقار اک راہ

کلام ملا رموزی کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملا رموزی نے اردو شاعری کے سبھی مروجہ اور پامال موضوعات سے شعوری طور پر اجتناب کیا ہے۔ وہ عشق کے وقار اور عاشق کی خودداری کے قائل تھے۔ ان کے یہ اشعار ان کے انہی فکر و خیال کی عکاسی کرتے ہیں ۔

غرورِ حسن کیا ہے؟ عشق اگر خوددار ہو جائے
نثارِ عشق اک دن سطوت شاہانہ ہو جائے
خوددار ہو کہ سطوت شاہان غلام ہو
عاشق جو ہو تو اتنا تو عالی مقام ہو

ملا رموزی کا یہ دعویٰ حرف بہ حرف صحیح ہے کہ

مری غز ل میں جمال اور وقار عشق بھی ہے
ادائے حسن بھی ہے اقتدار عشق بھی ہے

ملا رموزی کی غزل ''رقیب'' کے ذکر سے عاری ہے۔ عاشق معشوق اور رقیب کے مثلث کو وہ بے حیائی بے غیرتی اور بداخلاقی پر محمول کرتے ہوئے رقیب سے متعلق لکھتے ہیں:

''غزل میں رقیب کا کردار قوم کے لیے حد سے سوا ذلت، بے حیائی، بے شرمی، بے غیرتی اور خودداری کے حق میں تباہ کن ذخیرہ پیدا کرنے والا کردار ہے......
اس لیے غزل میں رقیب کا تذکرہ بند ہونا چاہیے۔
غزل میں بھری محفل میں محبوب یا محبوبہ کا بن سنور کر بیٹھنا اور بھری محفل میں اس کا غیروں سے اختلاط اور عاشق سے بے رخی وغیرہ یہ کردار بھی بازاری ہے کہ یہ تمام چیزیں کسی شریفانہ حسن وشوق میں کہاں؟''

(ماخوذ: مقدمہ: غیر مطبوعہ دیوان رموزی ص 21)

کلام ملا رموزی میں حسن وعشق سے متعلق جذبات کا اظہار، مشرقی اقدار کی حامل پاکیزہ اطوار میں اسی طرح ہوتا ہے۔

ادھر جوانی کے ولولے ہیں مگر ہے ان میں بھی یہ بلندی
نظر میں یوسف کی عصمتیں ہیں حیا میں پرہیز گاریاں ہیں
جمال رنگیں، نگاہ رنگیں، شباب رنگیں، دماغ رنگیں
خیال رنگیں، وصال رنگیں، دلوں میں الفت شعاریاں ہیں

رخ روشن پہ ہلکی سرخیاں یہ جھلملاتی ہیں
کہ موج لالہ کے کچھ شبنمی داماں لرزتے ہیں
وہ موج لالہ اس انداز سے آئی مری خاطر
کہ اس پر وجد کرتے تھے حجابات عروسانہ

یہ حد دلکشی ہے میرے ہاں شعر و نظر تک میں
ہوئی ہے ناز برداری کو اک موج گہر میری

ملا رموزی مصنوعیت کے قائل نہ تھے ان کے عشقیہ شاعری میں بھی حقیقت پسندی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے اور لفظیات، مصطلحات، تشبیہات و استعارات کے استعمال میں بھی انھوں نے اسی حقیقت پسندانہ رویے کو روا رکھا ہے۔ بقول خود:

''قرین عقل تشبیہات واستعارات کو جائز سمجھتا ہوں لہٰذا میرے یہاں تشبیہات و استعارات اور اشارات کا استعمال ہے لیکن کافی حد تک قرین عقل وفطرت۔''

(مقدمہ ''دیوان رموزی'' غیر مطبوعہ)

اس نوع کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں ۔

وہ اس کی ہر لحظہ مست آنکھوں میں اک خمار جمال آرا
شفق کے دامن میں صبح کوثر کا جیسے لرزاں شراب خانہ

یا

اک جشن میں جانے کو ہے اب اور سنور کر
یہ ثروت فردوس، یہ دوشیزۂ دوراں

ملا رموزی نے اپنی غزل میں پند و نصیحت اور فلسفہ و معرفت و تصوف کے موضوعات کو بھی پیش نہیں کیا۔ فطری اور حقیقی انسانی جذبات و احساسات کا اظہار نیز قدرتی مناظر کا ذکر ان کے یہاں حقیقی اور فطری انداز میں اس طرح ملتا ہے ۔

سویرے باغ میں باد بہاری جیسی آتی ہے
نہا کر گھاٹ پر جیسے جوانی مسکراتی ہے

دلہن کی طرح شاخ گل افشاں میں لچک ہے
اور لرزش لالہ میں عروسانہ حجاب آج

گھٹاؤں پر پر گھٹائیں آرہی ہیں باغ جنت سے
بدلنے کو تھا نقشہ اس زمیں کی ساری وسعت کا

کہسار میں، صحرا میں ہیں ٹیسو کے شگوفے
ہم مایۂ مرجاں کہیں، ہم رنگ گلاب آج

کالی گھٹاؤں میں ہے کوئی مغفرت ضرور
مسرور ہیں جو بعض گناہگار ان دنوں

غرض یہ کہ ملا رموزی نے اردو نثر کو گلابی اردو کا نیا اسلوب ہی عطا نہیں کیا بلکہ اردو شاعری خصوصاً غزل کے موضوع اور مزاج کو بھی نیا لباس پہنا کرا سے نئی امیجری، نئی معنویت، نئی حسیت اور نئے مفہوم سے آراستہ کر کے آنے والے شعرا کے لیے ایک نئی راہ تعمیر کر دی ہے۔ شاعری کو زندگی اور اس کے معاملات ومسائل کا ترجمان بنادیا ہے اس طرح ملا رموزی کو محض نثر میں ہی نہیں شاعری میں بھی موجد کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

وہ غزل کو کمالِ عقل کا ترجمان اور باوقار بنانا چاہتے تھے۔ ان کی غزل نما نظم (مطبوعہ ماہنامہ ''عندلیب'' ''بمبئی'') کے درج ذیل اشعار کے مطالعے سے شاعری سے متعلق ملا رموزی کے اجتہادی اور اصلاحی طرز فکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مشاعروں میں ہے اردو کی صرف نالہ و آہ
یہ وجہ ہے کہ ہے شاعری کی خود یہ حد نگاہ
دماغ عرش نظر ہو تو فکر عالی ہو
نکالیں تب یہ محبت مین باوقار اک راہ
نظر ہے پست، تو محبوب تک سے عشق میں بھی
برابری کو یہ شاعر سمجھ رہے ہیں گناہ

کمال عقل غزل کے لیے ضروری ہے
نہیں تو ہو کے رہے گی غز ل ہمیشہ تباہ
یہ کوئی عقل ہے، محبوب اپنے عاشق سے
تمام عمر میں اک دن بھی نہ کرسکے نباہ
بجز فراق کے اور ذلتوں کے عاشق کو
نصیب ہو نہ کبھی وصل اور عزت و جاہ
غزل میں ذلت عاشق کو اور میں کیا کہوں
مگر یہی کہ ہے شاعر کی خود ہی عقل سیاہ
ذلیل و خستہ و محروم اور غلام عاشق
غزل میں اردو کی یہ عشق ہے خدا کی پناہ
غزل ہے بند شروط زحاف و ایطا میں
کہے تو کیا کہے اب شاعرِ ترقی خواہ
گرفت کرتے ہیں زیر و زبر کی شعروں میں
یہ اس لیے ہے کہ حد نظر ہے خود کوتاہ
مزاج نوحہ گری ہند کو ملا جب سے
دماغ میں بھی نہیں اب مزاج شہنشاہ
ہے کاروبارِ غزل بعض ایسے ہاتھوں میں
جو فطرتاً بھی نہیں خود پسند و خود آگاہ
مری غزل میں جمال اور وقارِ عشق بھی ہے
ادائے حسن بھی ہے، اقتدارِ عشق بھی ہے

مذکورہ بالا اشعار میں ملا رموزی نے سخت زمین میں مسائل غزل کو آسان اور رواں انداز میں پیش کر کے اپنے عصر اور آنے والی نسل کے شعرا کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے

تا کہ اردو شاعری خصوصاً غزل کا گھسا پٹا، لایعنی اور پامال انداز تبدیل ہو سکے اور وہ مروجہ خیالی انداز کے بجائے حقیقی انسانی جذبات واحساسات کی ترجمان بن کر ایک پراثر، باوقار صنف سخن کی حیثیت سے قارئین کا دل موہ سکے۔

◆◆◆

تنقیدی محاکمہ

اُردو زبان کا شمار ہندوستان کی جدید زبانوں میں ہوتا ہے۔اس زبان کی تشکیل وتعمیر نیز ترویج واشاعت میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے اشخاص وافراد کی باہمی کوششوں کو جہاں خاص دخل حاصل ہے وہیں عربی، فارسی، ترکی زبانوں کے علاوہ ہندستان کی مختلف بولیوں اور علاقائی زبانوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔کم مدت ہی میں اس زبان نے نہ صرف عوامی مقبولیت حاصل کرلی ہے بلکہ ایسا وقیع اور معیاری علمی، ادبی سرمایہ سے بھی مالا مال ہے جسے ہم عالمی شہرت یافتہ زبانوں کے ادب کے سامنے فخریہ طور پر پیش کرسکتے ہیں۔

اُردو زبان کے شعرا وادبا ابتدا ہی سے ملک وقوم کے مسائل کی ترجمانی میں فکرمند ومصروف نظر آتے ہیں۔اردو زبان وادب نے تحریکِ آزادی میں جہاں نمایاں کردار ادا کیا ہے وہیں ہر عہد میں ملکی اور بین الاقوامی سیاسی، سماجی، تہذیبی حالات اور مسائل کو عنوان بنا کر زندہ، پُراثر اور قومی زبان ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

قومی، ملکی اور بین الاقوامی مسائل ومعاملات کی ترجمانی میں جن اردو قلم کاروں نے اہم ادبی خدمات انجام دی ہیں اُن میں معروف ومشہور ادیب، طنز ومزاح نگار، کالم نویس، شاعر اور مخصوص طرزِ نگارش گلابی اردو کے موجد، ضیاء الملک، محمد صدیق رشاد توحیدی، ملا رموزی کا نام بھی خاص

اہمیت کا حامل ہے۔

ملّا رموزی نے مخصوص سیاسی اور سماجی حالات سے متاثر ہوکر مخصوص مقاصد کے حصول کی خاطر 1917 میں اپنی ادبی زندگی کا آغاز کالم نویس اور مضمون نگار کی حیثیت سے کیا تھا اور آخری سانس تک وہ قلم و کاغذ سے اپنا رشتہ استوار رکھ کر ملک و قوم کی خدمت میں منہمک و مصروف رہے۔

ملّا رموزی نے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی حالات سے متاثر ہوکر ادبی میدان میں قدم رکھا اور ہندستانی معاشرے کی اصلاح، بیداری اور ملک کو آزاد کرانے کی غرض سے نثر اور شاعری دونوں میں اپنی تخلیقی ادبی صلاحیتوں کا اظہار پوری ذمے داری اور مستقل مزاجی کے ساتھ کیا۔ اپنے وطن اور ہم وطنوں سے متعلق مختلف النوع سیاسی، سماجی، معاشی، اخلاقی اور تہذیبی معاملات و مسائل پر اظہار خیال کے جذبے نے انھیں زود نویس قلم کار بنادیا۔ اپنی 56 سالہ زندگی میں انھوں نے 35 سال کا طویل عرصہ ادبی خدمت میں گزارا۔ مختلف موضوعات پر 50 سے زیادہ کتابیں اور اخبارات و رسائل کے لیے بے شمار کالم، مضامین، اور اشعار تحریر و تخلیق کرکے اور اردو نثر میں ایک نیا اُسلوب 'گلابی اردو' ایجاد کرکے ملک گیر شہرت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

ملّا رموزی نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے طنز و مزاح کا سہارا لیا لیکن ان کا طنز و مزاح تفنن و تفریح کے لیے نہیں بلکہ اصلاح اور بیداری کے جذبے کو عام کرنے کے لیے تھا۔

ملّا رموزی نے ہندستان کے قومی، ملی مسائل خصوصاً مسلمانوں کے ملکی اور بین الاقوامی معاملات و مسائل پر بھی جم کر لکھا اور اپنے مدبرانہ، قومی اور اصلاحی خیالات سے ایک عالم کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ ملّا رموزی کی تحریروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سماجی مصلح اور سیاسی طنز نگار تھے۔ عصری سیاسی، سماجی حالات نے انھیں سیاسی طنز و مزاح نگار بنادیا تھا۔ سنجیدہ سے سنجیدہ اور پیچیدہ سے پیچیدہ، سیاسی، سماجی موضوعات و مسائل کے اظہار میں بھی طنز و مزاح کا پہلو ان کے یہاں نمایاں نظر آتا ہے۔

متعلقہ موضوعات پر ان کے مشاہدے کی گہرائی، معلومات کی وسعت، جزئیات نگاری، ذہانت، صاف گوئی، جرأت رندانہ اور اظہار بیان کی قدرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی:

''ملاّ صاحب کی تصنیفات بعض حیثیت سے بے مثل ہیں۔ ان کو ایسی ایسی ظرافتیں بھی سوجھ جاتی ہیں جہاں بہ مشکل کسی کی رسائی ہوسکتی ہے۔ جونہایت درجہ دلکش اور پُر لطف ہوتی ہیں اور جہاں تک ہر شخص کا پہنچنا قطعاً آسان نہیں ہے۔'' (ماخوذ: طنزیات ومضحکات، ص166)

خیال کی متانت اور اظہار کی شگفتگی کے ساتھ طنز نگاری ملاّ رموزی کے مضامین کا نمایاں وصف ہے جس کے سبب ان کی تحریروں میں دروں بینی اور بوقلمونی کی خصوصیات پیدا ہوگئی ہیں۔ ان کے فن کی خوبی یہی ہے کہ وہ اپنے عہد سے جڑا ہوا ہے۔ ان کے مضامین ان کے عہد کے حالات کے ترجمان ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں اپنے عہد کی جیتی جاگتی زندگی کو پیش کیا ہے۔

وہ اپنے عہد کے ایک بڑے حقیقت نگار تھے۔ ان کی تحریریں محض ہنسنے ہنسانے کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ ایسے سیاسی، سماجی، تاریخی حالات کی عکاس بھی ہیں کہ جن کے مطالعے سے متعلقہ موضوعات پر قارئین کو معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں اور رہنمائی بھی ملتی ہے۔ اس اعتبار سے ان کی تخلیقات ہمارے لیے محض اہم ادبی سرمایہ ہی نہیں بلکہ وقیع تاریخی سرمائے کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔

ملاّ رموزی کا مطمحِ نظر وسیع تھا۔ وہ ملک کو آزاد دیکھنے کے علاوہ قوم کو دیگر ترقی یافتہ اقوام کی طرح باعمل اور بیدار دیکھنا چاہتے تھے۔ انھیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ معاشرے کی اصلاح اور نئی نسل کی ذہنی فکری اور عملی تعمیر وتربیت میں خواتین اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ''خواتینِ انگورہ' 'عورت ذات' 'شادی زنانِ مصر' جیسی تصانیف اور بے شمار مضامین اور کالم تحریر کر کے اور اشعار کہہ کر اپنے عہد کے بڑے تانیثیت پسند (Feminist) ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

ملاّ رموزی اپنے عصر کے ساتھ اپنے شاندار ماضی سے بھی وابستہ تھے اور روشن مستقبل کے خواہاں بھی۔ ہندستانی، مشرقی اقدار وروایات انھیں اس لیے عزیز تھیں کہ انہی کے سبب ہماری پہچان اور ہمارا وجود برقرار رہے۔ وہ مغربی تہذیب وتمدن کی کورانہ تقلید کے سخت خلاف تھے۔

اُن کا خیال تھا کہ نئی مغربی تہذیب آنے والی ہندستانی نسل کے مستقبل کو تاریک اور ہمارے تہذیبی ورثے اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کو پامال کردے گی۔ نئی نسل میں مجاہدانہ جذبات کے بجائے پژمردگی اور بزدلی کے جذبات پیدا ہوں گے، ایجاد واختراع کی جگہ نقل وتقلید کا رجحان بڑھے گا اور

محنت ومشقت کے بجائے تن آسانی اور فیشن پرستی کو فروغ ملے گا۔

غیر ملکیوں کی حکومت، ہندستان کی غلامی اور قوم کی زبوں حالی کی طرح خود ملّا رموزی کے گھریلو، معاشی حالات اچھے نہیں تھے۔ آنکھ کھولتے سے ہی اُنھیں ملکی سطح پر سیاسی ابتری اور گھریلو سطح پر افلاس اور معاشی بدحالی سے دوچار ہونا پڑا۔ قومی حمیت، وطن پرستی، احساسِ ذمے داری اور فرض شناسی نے انھیں بے چین و بے قرار ہی نہیں رکھا بلکہ نامساعد حالات اور محدود وسائل کے باوجود وہ درپیش سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشی حالات سے نبرد آزما ہونے، نجات حاصل کرنے اور ان کی اصلاح کی خاطر وہ صغر سنی ہی میں کمر بستہ ہو گئے۔

ملّا رموزی کے عہد میں 'سیاست' سب سے بڑا مسئلہ تھا جس کے سبب ہندستانیوں کی زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہو رہا تھا۔ انگریز حکمراں سیاسی شعبدہ بازی اور سازشوں کے سبب ہی ہندستان پر نہ صرف برسرِ اقتدار تھے بلکہ انھوں نے ہندستانیوں کی زندگی کو جہنم زار بنا دیا تھا۔ ملا رموزی کو اس بات کا بخوبی احساس تھا چنانچہ انھوں نے سیاسی موضوعات پر ہی توجہ صرف کی اور سیاسی موضوعات کے اظہار میں طنز و نشتریت کو بطور ایک کارگر حربے کے استعمال کیا۔ اس اعتبار سے وہ ملک کے بڑے سیاسی طنز نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ سیاسی معاملات و مسائل کے اظہار کے لیے انھوں نے جہاں لائڈ جارج کو اپنا شاگرد رشید بنا کر، اس کی زبانی ملکی اور بین الاقوامی سیاست کے اہم نکات پیش کیے ہیں وہیں، 'ننھے میاں کی والدہ' 'خالہ نے الیکشن لڑا' 'بیوی نمبر ایک، دو، تین' کے فرضی کرداروں اور عورت ذات، کے عنادین سے اپنے عہد کی خانگی زندگی کے مسائل کو بھی بطریقۂ احسن قلمبند کر کے ان کے حل کے تئیں نہ صرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے بلکہ ان کی اصلاح و ہدایت نیز ہنسنے ہنسانے کا سامان بھی فراہم کیا ہے۔

سماج میں پھیلی ہوئی عام مایوسی اور اُداسی کو دور کرنے کی خاطر ظرافت اور طنز کو ہتھیار بنایا اور ایک خاص مقصد کے حصول کی خاطر مخصوص انداز میں لکھنا اور چھپنا شروع کر دیا۔ تحریر و تصنیف ان کا اخلاقی اور اصلاحی فریضہ بھی تھا اور ذریعۂ معاش بھی۔ انھوں نے عصری مسائل و موضوعات کو عنوان بنا کر ان کی جانب توجہ مبذول کرائی اور قوم کو حقائق سے آگاہ کرنے کے ساتھ اُس کے ذہن و دماغ سے مایوسی، اُداسی اور پژمردگی کو ختم کرنے کی سعی بھی کی اور پُر لطف، شگفتہ اور پُر مغز تحریروں سے ان کی

ذہنی تفریح، بلند حوصلگی اور دل بستگی کا سامان بھی فراہم کیا۔ بقول فرقت کاکوروی:

"اُن کی ظرافت، ان کے اندازِ بیان میں پوشیدہ ہے۔ وہ کسی واقعے کو نمک مرچ لگا کر نہیں بیان کرتے بلکہ اسلوبِ بیان کے ذریعے ایک مزاح پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں آورد کم اور آمد زیادہ ہے۔ جتنا جتنا وہ جذبات کی گہرائیوں میں جاتے ہیں اتنا ہی پڑھنے والے کو ہنسی آتی ہے..."

(ماخوذ: اردو ادب میں طنز و مزاح، ص 211)

شاعری میں اگر چہ انھوں نے صنفِ غزل کو وسیلۂ اظہار بنایا اور اس کے ذریعے ہی اپنے افکار و خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن جس طرح نثر میں انھوں نے 'گلابی اردو' اور 'نکاتی اردو' جیسے نئے طرز اسالیب ایجاد کیے اسی طرح غزل کے مزاج اور موضوعات میں بھی نمایاں تبدیلیاں کی ہیں۔ ملا رموزی غزل کے روایتی انداز اور مروجہ و مقررہ قدیم موضوعات و کردار و مصطلحات کے استعمال کے قائل نہیں تھے۔ انھوں نے اردو غزل کو محض حسن و عشق کے معاملات کے اظہار کی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے مصنوعی انداز کو ختم کرنے کے لیے اسے عصرِ حاضر کے معاملات و مسائل اور حقیقی زندگی کی ترجمانی کے لیے استعمال کیا اور اردو نثر کی طرح اردو غزل کو بھی ایک نیا انداز، ایک نیا حقیقی لہجہ عطا کر کے اسے سماج اور زندگی سے قریب تر کرنے کی سعی کی۔ ان کی غزلیں مریضانہ عشق، بے عمل مایوس عاشق، موقع پرست رقیب، مصنوعی حسن کی جلوہ سامانیوں، مخربِ اخلاق باتوں، جنوں خیزی، دیوانگی، صحرا نوردی، ہجر کی اذیتوں، عاشق کی ناکامیوں اور حسرت ناکیوں اور لایعنی شعری تراکیب و اصطلاحات سے عاری نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اپنی غزل کو اردو کی روایتی غزل کے عیوب سے پاک و صاف کر کے زندگی کے حقیقی مسائل کا ترجمان بنا دیا تھا۔ ملا صاحب کی شاعری بجو یہ ظرافت پر مبنی ہے لیکن نثری تحریروں کی طرح غزل میں بھی ان کا مطمحِ نظر اخلاقی، تعمیری اور اصلاحی تھا۔ ان کی نثری اور شعری تخلیقات کا بڑا حصہ عورتوں کی اصلاح و رہنمائی سے متعلق ہے اور بڑی حد تک عورتوں کی مدافعت میں ہے۔

اردو کی روایتی غزل میں انھوں نے جو اصلاحات کی ہیں اُن کا اظہار انھوں نے اپنے پہلے مطبوعہ غیر دستیاب دیوان "مہرِ درخشاں" میں شامل مقدمہ میں کیا ہے۔ غزل میں ضروری ترمیم و

اصلاح سے متعلق تحریر کردہ ان کی باتوں سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ وہ محض اردو نثر میں ہی نہیں اردو غزل گوئی میں بھی 'موجد' کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

مذکورہ بالا دیوان اور اس میں شامل مقدمہ کو پڑھ کر پروفیسر لیاقت حسین شوقی نے لکھا تھا:

''حیران ہوں کہ ملّا رموزی کی اس دماغی لاجوابی پر کیا لکھوں، جس نے ساڑھے تین سو برس کی غزل گوئی کے اصول ہی کو بدل کر رکھ دیا اور وہ غزلیں کہہ دیں جن کے جواب سے آج تک کی کروڑوں غزلیں قاصر ہیں''۔

(ماخوذ: 'مقدمہ' مشمولہ کتاب 'ملّا رموزی'، مرتبہ حسن صولت جالندھری، 1935)

مذکورہ بالا دیوان کے مقدمے میں ملّا رموزی نے لکھا ہے:

''آج تک کی غزل گوئی میں عورت کے وفادارانہ کردار پر جو ناپاک اور گندے حملے اور الزامات ہیں، میں اپنی غزل سے ان کو مٹا کر عورت کی وفا و مروّت کا صحیح کردار پیش کروں گا''۔

ملّا رموزی نے ایڈیٹر 'صدائے نسواں' دہلی کے نام خط میں لکھا تھا:

''اب میری شاعری کا خلاصہ سن لیجیے۔ وہ یہ ہے کہ یہ شاعری میں نے عورت ذاتوں کی حمایت اور حفاظت میں شروع کی ہے۔ یعنی اردو کی شاعری نے عورت کے خلاف جو گندہ، غلط اور خلافِ فطرت ذخیرہ جمع کیا ہے میں نے اس کا جواب اپنی شاعری میں دیا ہے۔ اب یہ آپ کو اس وقت معلوم ہوگا جب میرا دیوان میرے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوگا اور انشاء اللہ اُسی وقت دنیا بھر کی عورتوں کو معلوم ہوگا کہ ان کے حق میں آج تک کی اردو شاعری کس درجہ گندی، ناپاک اور خلافِ عقل و اخلاق تھی اور ملّا رموزی نے کتنا لاجواب، جواب دیا ہے....''

(کلیات ملّا رموزی، جلد سوم، ص 664، مرتبہ: خالد محمود مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)

زود نویسی اور ہنگامی حالات کا عکاس ہونے کے سبب بعض ناقدین نے ملّا رموزی کی تحریروں اور تخلیقات کو وقتی قرار دینے کی کوشش کی ہے لیکن یہ بات ملّا رموزی کی تمام تحریروں پر اس لیے صادق نہیں آتی کہ ملّا رموزی کی تمام تحریریں وقتی یا ہنگامی حالات کا نتیجہ نہیں ہیں اور یہ بھی حقیقت

ہے کہ ہر ہنگامی موضوع، وقتی یا محدود نہیں ہوتا کہ بعض ہنگامی حالات ایسے بھی ہوتے ہیں جو تاریخ وادب کا اہم حصہ بن جانے کے سبب، ہمیشہ اپنی اہمیت اور معنویت کے حامل بن جاتے ہیں۔ یہی بات ملا رموزی کی بیشتر تحریروں کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ ملا رموزی کی بعض تحریروں کا کینوس جن میں انھوں نے سیاسی، سماجی یا اجتماعی مسائل کو موضوع نہ بنا کر محض اپنی ذات کی محرومیوں اور نا آسودگیوں کو ہی موضوع بنایا ہے، بہت محدود نظر آتا ہے۔ بار بار اپنی شخصیت اور نامساعد حالات موضوع بحث بنانے کے سبب ان کے اس نوع کی تحریروں میں یکسانیت اور بوجھل پن پیدا ہو گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید حامد حسین:

> ''ملاّ رموزی ایک مزاح نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں لیکن بعض اوقات ان کے مزاح کے لطف و نزاکت کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ رموزی خود ہنس کر ہنسانا چاہتے ہیں اور کبھی کبھی تو زندگی کی تلخ حقیقتوں پر بھی ان کی ہنسی کی آواز اتنی اونچی اُٹھ جاتی ہے کہ وہ طنز سے بھی گزر کر انسانیت پر ایک تمسخر معلوم ہونے لگتی ہے۔ ملا رموزی اس طرح تلخ حقیقتوں کو ایک گوارا شکل دے کر پیش کرنا چاہتے ہیں، کبھی وہ اس میں کامیاب ہوتے ہیں اور کبھی ناکامیاب۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ملا رموزی نے لکھتے وقت قاری پر اس کے پڑنے والے اثرات پر بہت کم دھیان دیا۔ رموزی کی سوجھ بوجھ بہت اچھی ہے لیکن مزاح میں ایک بہاؤ، ایک فطری تسلسل چاہیے اور ملاّ رموزی کا مزاح کبھی کبھی ڈھکیل ڈھکیل کر آگے بڑھایا جاتا ہے اور کبھی وہ انسانی زندگی کی کمزوریوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ رموزی کا مزاح زیادہ تر الفاظ پر منحصر ہے اس لیے اس میں ایکشن (Action) کی گنجائش کم ہے اور اس کے نتیجے میں کہیں کہیں ایک طرح کا ٹھہراؤ اور سپاٹ پن محسوس ہونے لگتا ہے''۔

(ماخوذ، مضمون: 'ملا رموزی' مطبوعہ ماہنامہ 'زنجیر' بھوپال 1964ء، جمہوریت نمبر، ص 5)

واضح ہو کہ متذکرہ بالا عیوب یا ناہمواریاں انہی مضامین میں نظر آتی ہیں جو کہ ملا رموزی کی ذات، نجی حالات یا مقامی موضوعات سے متعلق ہیں جبکہ عالمی سیاست یا بین الاقوامی

موضوعات پر لکھے گئے ان کے مضامین مذکورہ بالا عیوب سے پاک ہیں اور اس سطح پر ان کا فن انفرادیت کے تنگنائے سے نکل کر اجتماعیت کی وسیع قلمرو میں داخل ہو کر ایک خاص معنویت اور اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔

ملا رموزی کی تخلیقات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تحریریں قدیم اور جدید تہذیب و اقدار سے پیدا ہونے والے حالات کا نتیجہ تھیں۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر سیاسی، سماجی منظر نامے میں جو تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں مُلّا رموزی اُن پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ اس بدلتے ہوئے سیاسی منظر نامے میں ہندستان اور ہندستانیوں کے وجود کا مسئلہ بھی درپیش تھا اور ان کی ترقی اور مستقبل کا بھی! ملا رموزی ہر حال میں ملک و قوم کی ترقی، آزادی، خوش حالی اور تشخص کے تئیں نہ صرف فکرمند رہے بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعے قوم کو باخبر اور بیدار کرنے اور صحیح رہنمائی کرنے کی سعی کرتے رہے۔ اس اعتبار سے ان کی تحریریں اور تخلیقات خواہ سنجیدہ ہوں یا طنزیہ مزاحیہ اس خاص مقصد کی حامل قرار دی جا سکتی ہیں جو کہ انسانیت کا حامل تھا جس میں اصلاح و عمل اور بیداری و اتحاد کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔

ملا رموزی بھوپال کے طنز و مزاح نگاروں کے امام تسلیم کیے جاتے ہیں اور ملک گیر سطح پر بھی ان کے ذکر کے بغیر اردو طنز و مزاح کی تاریخ مکمل قرار نہیں دی جا سکتی ہے۔

◆◆◆

مصنف کی تحریروں کا جامع انتخاب

ہندو مسلمانوں کا انگوری اتفاق

اے کمیشن کے اونچے ممبرو! خبرداری اور آگاہی ہے واسطے تمھارے کہ نہ بات کرنا تم بیچ اس زمانے کے خواجہ حسن نظامی صاحب سے فکرمند ہیں وہ بہت۔ گرفتار کرا دے اللہ قاتل خسران کے کو اور ایسے لیڈروں کو جو دھوکا دیں قوم اپنی کو خاص واسطے غرض اپنی کے اور پائیدار کردے اللہ اس ہندو مسلم اتفاق کو کہ نظر آرہا ہے وہ بیچ اس زمانہ ہذا کے۔ پس جب زدوکوب کرتے تھے اوپر پلیٹ فارموں ریل کے یہ ہندستانی ٹکٹ کلکٹر بے ٹکٹ افلاس کے مارے ہوئے سادھوؤں اور فقیروں کو تو چوٹ اوپر دل ہمارے کے لگتی ہے اوپر غربت اور پریشانی ہندستانیوں کے پس ایسے ہی ہندستانی ٹکٹ کلکٹر بیچ زمانہ سوراج کے سوار کرائے جائیں گے اوپر سواری عیسیٰ علیہ السلام کے اور حجامت بنائیں گے ان کی صدر صاحب راجہ کانفرنس امرت سر کے بھی اس طرح غرور اور تکبر بڑھ جاتا ہے صوبہ سرحد سے ان ہندستانی افسروں کا جنھوں نے تعلیم پائی ہے کالجوں کی اور ترک کرتے جاتے ہیں ہندستانی تہذیب بزرگوں اپنے کی سبب سے کثرت قینچی چھاپ سگریٹ اور تھیٹروں کے۔ پس جلدی شادی کرادے اللہ مہاراجہ اندور کی ہمراہ مہارانی طرکے تاکہ نہ تباہ کرسکیں مہاراجہ صاحب روپیہ زیادہ بیچ اس باب کے اور محفوظ رکھے اللہ تمام والیان ریاست کو

اس عادت سے مہاراجہ صاحب اندور کی۔ پس البتہ تحقیق کہ پائیں گے یہ تمام ہندستانی بیچ نظر دنیا تمام کے اگر اتفاق کر لیا انھوں نے آپس میں عزت کیونکہ بری ہے عادت فیشن انگریزی کی ورنہ کیا نہ سنا تم نے اے شاگردو ہمارے کہ گلا کٹ گیا تھا بادشاہ افغانستان کا بیچ شہر بروسلز بلجیم کے جبکہ مونڈھ رہے تھے وہ داڑھی اپنی موافق قاعدہ انگریزی کے۔ پس جس نے کہ ترک کیا فیشن انگریزی تو بیچ دن حکومت سوراج کے لاٹ پادری بنائے گا اللہ اس کو شہر لاہور کا مگر شرم بہت واسطے ان ہندستانی پروفیسروں اور ماسٹروں کے ہے کہ سامنے طلبا کم سمجھ اور کم عمر کے پڑھتا ہے بہت۔ پس نہیں متوجہ ہوتے یہ ممبر کونسل کے طرف گرانی لفافوں اور کارڈوں کے، اگر چہ روزانہ تکلیف ہوتی ہے باشندوں غریب کو۔ پس اگر ہیں ہمدرد بہت ممبر سائمن کمیشن کے تو بدلے سیاحت دیہات کے۔ ارزاں کرادیں وہ لفافے اور کارڈ۔ بھی آزادی دلادیں وہ اخبارات اردو کو برابر آزادی "پائینر" کے کیونکہ اوپر اسی جگہ کے نوشیرواں عادل نے کہی ہے مبلغ ایک رباعی:

اے اندھے حافظ جی اگر وصل چاہتے ہو تم
تو صلح کراؤ تم ہندو مسلمانوں کی
ساتھ مسلمانوں کے مصافحہ کریں ہندو
اور معانقہ ساتھ ہندوؤں کے مسلمان

پس قسم ہے جلا ہوں ہندستان کی کہ نہیں ہوگا مبلغ ایک شعر عمدہ ایسا جیسا کہ کہا نوشیروان عادل نے اوپر ان سطروں چند مضمون ہمارے کے۔ توفیق دے اللہ ہندستانیوں کو عمل کی اوپر باتوں ہماری کے کہا ہے۔

◆◆◆

اسلامی نو روز

اے انگریزی میں دستخط کرنے والو! وہ کچھ سنا تم نے کہ شروع ہوا مبلغ ایک محرم الحرام سے سال 1357 ہجری مسلمانوں کا، یعنی سال نو اسلامی۔ پس بشارت و خوشخبری ہے واسطے مسلمانوں دنیا تمام کے اندر اس سال ہذا اسلامی کے کہ تحقیق بھول گئے 99 فی صدی مسلمان سنہ

وسال اور ماہ وتاریخ اسلامی اپنی کو بہ سبب فیض وبرکت تعلیم بی۔اے کے، غیر بی۔اے کردے اللہ ایسے مسلمانوں کو جوترک کر چکے ہیں تہذیب وتمدن اسلامی اپنے کو بہ سبب کمزوری دماغ اپنے کے۔ پس قسم ہے درجہ سوم بیل گاڑیوں کی کہ چلائی جاتی ہیں وہ بیچ دیہات ہندوستان کے اور تکالیف اٹھاتے ہیں ان سے مسافرا ے تکالیف سخت۔ پس زکام اور کھانسی ہوجائے ایسی گاڑیوں کمزور اور شکستہ کو کیونکہ تحقیق نہیں ہے کوئی شک بیچ اس کے کہ دیکھا ہم نے اور منجھلی بیوی ہماری نے کہ آیا مبلغ ایک جرمن اخبار نویس سوار اوپر ایک لاری شکستہ کے۔ پھر داخل ہوا وہ ساتھ ادب واحترام بہت کے بیچ مکتب سیاسی ہم حضور ملا رموزی صاحب کے۔ زیادہ کرے اللہ بیویاں ہماری۔

پس اوپر فقط داخل ہونے اس کے کے کہا ہم نے اس سے کہ اے وہ تو جرمن اخبار نویس کہ تحقیق بغیر پروانہ راہ داری کے داخل ہوا تو بیچ مکتب ہمارے کے تحقیق ہے تو جاسوس۔ پھر کیا تو مخبری کرے گا مانند مخبری سی آئی ڈی والوں کے۔ تو قسم ہے کثرت بیڑی نوشی اور چائے نوشی کی کہ مسکرایا وہ جرمن اخبار نویس اور منہ بات اپنی کا اس طرح کھولا اس نے کہ اے محترم ملا رموزی صاحب محفوظ رکھے اللہ آپ کو فریب نمبر دو سے کہ نہیں ہے کوئی شک بیچ اس کے کہ حاضر ہوا ہوں میں بیچ خدمت فیض کی درجہ والی آپ کی کے، مگر واسطے اس کے کر سکوں میں معلوم کرنا اس بات کا کہ کیوں بھول گئے مسلمان ہندوستان کے تہذیب اسلام۔ بھی نوروز بنانا اپنا بھی بلکہ اس چاروں بیویوں انگریزی دان اپنی کے جرمنی تا لکھیں آپ وہاں مضامین ایسے۔ تو قسم ہے بے بسی باشندوں چین کی کہ تباہ کر رہا ہے ان کو جاپان اور بھولتے جارہے ہیں ان مظلوموں کو ہندستانی لوگ کہ وزیر جنگ بنادے آپ کو قدر دان قوم جرمنی کی اوپر فقط عمدگی مضامین اور غزلوں آپ کی کے۔ مگر اے عجیب وہ گھڑی حیرت کی بڑھانے والی کہ سکوت کیا ہے ہم نے اوپر اس بلاوے جرمنی کے کہ ناگاہ فرمایا بیوی نمبر چار ہماری نے کہ نہیں ہے کوئی شک بیچ قدر دانی اور علم دوستی قوموں یورپ کے، مگر نہیں سکتے ہیں جانا شوہر ہمارے طرف یورپ کے جب تک کہ نہ ادا کر دیں وہ مہر بھاری ہم بیویوں تمام کا جو ہے کئی لاکھ کیونکہ تحقیق تعداد مہر ہندستانی عورت کی ہوتی ہے موافق رسم کے نہ موافق شرع کے۔ پس جو مسلمان کے غیر شرعی باتوں اپنی کو سمجھتے ہوں شرعی۔ کون

ہوگا برابران کے جاہل؟ پس بہ سبب اس تباہ ہو رہی ہیں لاکھوں لڑکیاں بے شادی والی کہ نہیں ملتا ہے ان کو لڑکا بی۔اے پاس۔ بھی اسی طرح تباہ ہو رہے ہیں سینکڑوں لڑکے بی۔اے پاس تلاش میں مالدار بیوی کے۔یہ ہے نتیجہ غیر ملکی تمدن قبول کرنے کا کیونکہ جس قوم نے بحالت افلاس اور کم آمدنی کے اختیار کیا ہو سوٹ بوٹ یورپ کا تو اور نہ ہو آمدنی اس کی برابر یورپ والوں کے تو بداخلاق اور ذلیل ہوگی وہ بہ سبب شوق فیشن اپنے کے۔

پس جب سلسلہ کلام بیوی چھوٹی ہماری کا اوپر اس جگہ کے پہنچا تو بات کاٹی ہم نے اس کی اور کہا کہ دراز کرے اللہ عمر تیری اے بیوی ہماری اور محفوظ رکھے اللہ تجھ کو تماشوں سنیما کے سے۔ سچ کہا تو نے وہ جو کچھ کہ کہا تو نے اس جرمن بڈاسے اگر چہ بھول جانا نئے سال اسلامی کا اور نہ خوشی منانا اوپر اس موقع کے موت ہے قومی مسلمانانِ ہند کی۔ اگر چہ بہت دن گذرے کہ ترک کر دیا ہے انگریزی داں مسلمانوں نے لکھنا اوپر خطوں اپنے کے پتہ اردو کا۔ پس خوش رکھے اللہ ہندو بھائیوں کو کہ تحقیق ہر چیز لکھتے ہیں وہ بیچ ہندی کے اور مسلمان بیچ انگریزی کے بہ سبب غلام دماغ اپنے کے۔ بھی اسی طرح سینکڑوں لڑکیاں لکھتی ہیں خط بیچ انگریزی کے بہ سبب نخرہ انگریزی دانی اپنی کے۔ بھی بہ سبب اس کے کہ نہیں سکتی ہیں وہ لکھنا صحیح اردو کا بہ سبب نالائقی اپنی کے۔ پس حشر اردو ترک کرنے والوں کا ہوگا ہمراہ اندھے جاپانیوں اور لنگڑے چینیوں کے۔

کیونکہ باہر ہو جانا جمعیۃ اقوام سے اٹلی، جاپان اور جرمنی کا اچھا نہیں ہے واسطے امن یورپ کے۔ پس جب تک کہ نہ ہوں گے بیچ تعداد کے ترک لوگ برابر جرمنوں کے تو مشکل ہے محفوظ رہنا ان کا نقصانات سے۔ اگر چہ لاکھ مصطفیٰ کمال پیدا ہوں اندر ترکوں کے۔ یہی سبب ہے کہ حکم دیا ہے مصطفیٰ پاشا نے کہ بچے پیدا کرے قوم ترکی ساتھ کثرت کے چھوڑ کر تماشا سنیما کا۔ پس جب تک کہ نوجوان صاحبزادے اور صاحبزادیاں ہندوستان کی نہ اختیار کریں گی دیسی اور ہندستانی زندگی بھی مادری زبان اپنی ہرگز وہ معزز نہ ہوں گی بیچ نظروں ذی علم دنیا کے۔ پس بخار آجائے ایسی موٹر کاروں ~~~ بھاگتی ہیں اے بھاگ بے تحاشہ اور توفیق دے اللہ چھوٹی بیوی ہماری کو تا روزانہ خط لکھے وہ ہم کو میکے اپنے سے اگر ہو وہ عقل والی۔ بھی مبارک ہو یہ سال نو مسلمانوں دنیا تمام کو۔ اب پڑھ تو اے بیوی چھوٹی میری وہ شعر جو لکھا ہے میں نے:

ہرگز . نہیں مرے گا اورمرے گی
وہ جس کادل زندہ ہوساتھ عشق کے
لکھا ہوا ہے اوپر جریدۂ عالم کے بیچ اردو کے یہ
معاف کرے اللہ لمبائی اور درازی شعر ہماری کی کو

◆◆◆

مسلمانوں کی زعفرانی عید

اے بیوی کے احکام پر چلنے والو! خبرداری اور آگاہی ہے واسطے تمھارے اور تمام انگریزی یافتہ لوگوں کے کہ تحقیق آ گئی ہے وہ گھڑی کہ سخت آزمائے جاؤ گے تم ساتھ ایمانوں کمزور کے۔ پس اگر تم رکھنے والے عقل وفراست کے تو شتابی کرو تم واسطے حاصل کرنے عقل وخردمندی کے کہ تحقیق عمل عمدہ نشانی ہے مہربانی اللہ مہربان قدرت والے کی۔

امابعد! نہیں ہے تہوار عید کا واسطے تمھارے مگر ایک کانفرنس سیاسی، لیکن بہ سبب نہ ہونے عقل دینی کے تباہ کردیا ہے تم نے تہوار عید کے کو اور جرمنی وروس نے پولینڈ اور فن لینڈ کو بہ سبب قلت تعداد ان کی کے۔ اگرچہ قلت اولاد کی بہتر ہے کثرت سے اولاد کے۔ محفوظ رکھے اللہ ہم ملا رموزی صاحب کو کثرت اولاد اور مصارف اس کے سے۔ پس پڑھ لینا بی۔ اے تک نہ کام آئے گا اور نہ کام آیا مسلمانوں ہند کے مگر واسطے چند کے۔ پس البتہ تحقیق اگر نہ فراموش کرتے وہ علوم اسلام کو۔ بھی نہ فراموش کرتے وہ زبان اردو کو، بھی فراموش نہ کرتے وہ تہذیب اسلام کو، تو تحقیق یوں نہ بے حجاب ہوتیں لڑکیاں بعض مسلمانوں کی بغیر عمر وتعلیم بڑی کے۔ پس اندر جن گھرانوں کے کہ شوق ہے روزانہ سنیما دیکھنے مع عورتوں اور لڑکیوں بے پردہ کے تو تحقیق بے وقار ہوجائیں گے ایسے گھرانے اندر برادری بڑی اپنی کے۔ پھر جو گھرانے کہ بے وقار ہوجائیں بیچ نظروں عوام کے نظر بند ہوجانا بہتر ہے واسطے ایسے گھرانوں بے وقار وبے عظمت کے، بھی اسی طرح جب نہ رہا بیچ مسلمانوں ہند کے شعور سیاسی تو غالب لایا اللہ حکمت والا اوپران کے کانگریس کو، بھی نہیں ہیں اسی لیے اندر مسلمانوں دس کروڑ کے لیڈران کے دس ہزار الا مبلغ ایک محمد علی صاحب جناح۔ پس جب واسطے دس کروڑ مسلمانوں کے لیڈر ہو مبلغ ایک تو اندازہ کیجیے شعور سیاسی

ان کے کا۔قلت سے لیڈروں ان کے کے اور جو ہوتا علم سیاست اور ذوق سیاست بیچ مسلمانوں کے تو ہوتے آج مبلغ دس لاکھ محمد علی جناح ٹکرائے آہ کہ ذوق مسلمانوں جدید کا بدلے علم و سیاست کے ہے سیمنار، ریڈیو، پیانو اور مثل ان کے۔ پس اندر جس قوم کے شوق بڑھ گیا ہو لہو لعب کا تو تحقیق کے موٹر ڈرائیور بنائے جائیں گے اکثر ان کے بیچ اس دنیا ہٰذا کے اور محروم رہیں گی وہ تمام لڑکیاں وقار اور آرام سے جو چھوڑ کر اصول اسلامی اپنے کو نقل فرما رہی ہیں یورپ کی۔اگر بیچ تباہی لڑکیوں مغرب زدہ کے ہاتھ ہے باپوں اور بھائیوں ایم۔اے پاس ان کے کا اور اندر تباہی ایم۔اے پاس ہندستانیوں کے ہاتھ ہے ان کم نظر ماسٹروں اور ہندستانی پروفیسروں کا جو بقلم خود تھے نقال اور کمزور دماغ، اس لیے مرعوب ہوگئے دماغ ان کے آداب یورپ سے ورنہ اگر ہوتے اعلیٰ دماغ ماسٹر اور پروفیسر ہندستان کے تو خود ایجاد کرتے قاعدے اور ضابطے جدید ہندستانی تہذیب کے اور وضع کرتے جدید پاجامہ بدلے پتلون یورپ کے۔بغض و عداوت پیدا کردے اللہ مہربان قدرت والا درمیان روس اور جرمنی کے تا محفوظ رہے شر اور فسادوں اس کے سے دنیا تمام، بھی لائق ہیں جبری بھرتی کے وہ تمام ہندستانی تاجر جو گراں فروش ہوگئے ہیں بے وجہ ساتھ بہانے جنگ جرمنی کے، مگر اب بے وقوف اور بے شعور مسلمان کہ تحقیق آج بھی روپیہ بے دریغ خرچ فرما رہے ہیں اندر تقاریب ولیموں باراتوں اور عقیقوں بچوں اپنے کے۔پس عنقریب کامیاب ہوگی سیاست انگلستان کی مقابلہ میں سیاست کانگریس کے کیونکہ فرق ہے درمیان آزاد قوم اور غلام قوم کے اے فرق بڑا۔اگر چہ بیچ اخبار ٹائمس آف انڈیا کے لکھا تھا نوشیرواں عادل بھی وزیر بزرجمہر اس کے نے کہ یہ ہے لکھا ہوا ان کا:

کیا مہینے بہت اور کیا برس بہت
نہیں گزریں گے کہ پھر سے پردہ کریں گی لڑکیاں بے پردہ
بھول جائے تا جاپان فتح چین کو اور جرمن پولینڈ کو
جب کھائیں گے اتحادی اندر جمعیۃ اقوام کے پلاؤ اور زردہ

پس اے دکان پر اخبار پڑھنے والو! اگر دماغ درجہ اول کا ملا ہے تو تحقیق استعمال کرو تم لباس کھادی کا اور جمع کرو روپیہ بہت اندر گھر اپنے کے اور ترک کراؤ تم بیویوں اپنی سے استعمال

فیشی سے چیزوں کا کہ تحقیق حسن عورت کا قابلیت دماغی ہے نہ زیور۔ محفوظ رکھے اللہ ہر عورت کو لڑائی سے بوڑھی ساس اس کی کے اور بوڑھی ساس کو گستاخی سے بی۔اے پاس بہو کے اور محفوظ رکھے اللہ لڑکیوں مسلمانوں کو افسانوں، شاعری اور ریڈیو سے۔ بھی مجاہد اور بہادر پیدا کرے اللہ لڑکیاں مسلمان بدلے لڑکیوں آزاد خیال اور فیشی کے کیونکہ البتہ تحقیق روایت ہے ایک سے راویوں انگلستان کے کہ عزم واستقبال انگریزوں کا مقابلہ جرمنی کے۔ سبق ہے واسطے بے ہمت اور فیشی مسلمان زادوں کے جو بھاگ جاتے ہیں محنت سے تعلیم کے۔ پس اگر موافق قول بیوی نمبر چار ہماری کے چھڑ گئی لڑائی روس کی ہمراہ ترکی کے تو قسم ہے غیر سیاسی خطبوں نماز عیدین کی کہ توڑ دے گا ہڈی ریڑھ کی ترکی اور نہ ملیں گے مزدور رونے والے فوجوں بزدل روس کو اندر قفقاز کے۔ پس جو مسلمانان ہند کہ نہ طاقتور بنا سکیں ہوں مسلم لیگ کو موافق ضرورت طاقت ان کی کے تو کیا خاک مدد کریں گے وہ ترکی کی وقت ضرورت کے۔ لڑائی پر بھیج دے اللہ ان تمام ہندستانیوں کو جو پڑھتے ہیں روزانہ اخبارات اردو کے مفت اے بے خریدے کیونکہ اندر لڑائی روس اور فن لینڈ کے ثابت ہو گیا یہ کہ نہیں ہوتے قابل لڑائی خونریزی کے روسی مرد۔ پھر کیا ہمت جو لے جائیں وہ بازی ترکوں آگ اور خون سے کھیلنے والوں سے۔

پس جب تعریف کی لارڈز ٹلائیڈ نے مسلمانوں ہند کی بحیثیت ایک اعلیٰ قوم کے تو انڈے اور پراٹھے بھیجے ہم نے ان کو واسطے ناشتے ان کے کے۔ خضاب لاجواب کے قابل کرے اللہ ان عمروں کو جو ہو گئے ہیں ایڈیٹر اخباروں بعض کے بے خبر ضروریات ہم قومی سے مگر یہ کہ اوپر فقط اول فول مشق تحریر کے ایڈیٹر ہیں وہ۔ بھی اسی طرح توفیق دے اللہ امیروں اور دولت مندوں ہمارے کو تا ہمدردی کریں وہ غریبوں اپنے سے قبل خاتمہ جنگ جرمنی کے اگرچہ تباہ ہو رہے ہیں غریب مصنفین اور مضامین نگار اردو کے بہ سبب ناقدردانی امیروں اپنے کے۔ بھی اسی طرح راستہ بتا دے اللہ حکام مسلمان کو راستہ خریداری کتابوں اردو اور اخباروں اردو کا بدلے خریداری کتابوں اور اخباروں انگریزی کے جیسا کہ کہا گیا ہے مبلغ یہ شعر ہذا:

جس امیر نے کہ کتاب اور اخبار اردو کا نہ خریدا
ہرگز نہ سکے گا وہ جانا بیچ جنت کے

پس جتنی کہ کوشش کرتی ہیں لڑکیاں ہماری واسطے سنیما کے کاش وہ اتنی ہی مستعد ہوں بیچ تعلیمی محنت کے۔

پس جب سلسلہ کلام ہمارے کا اوپر اس جگہ کہ پہنچا تو دعا دی ہم نے انگریزوں کو اے دعا واسطے فتح جرمنی کے۔ زکام ہو جائے دائمی ہر جمن سپاہی کو تا بہ سبب کھانسی اور چھینکوں سخت کے نہ سکے وہ لڑنا ساتھ کسی کے اور بیچ عشق بازی کے مبتلا ہو جائیں جرمن حکام اور افسر فوجی تا بہ سبب تکلیف ہجر و فراق محبوبہ کے نہ سکیں وہ لڑنا اور لڑانا جرمن سپاہیوں کو ساتھ کسی کے۔ بھی مدد کرے اللہ چیمن وفن لینڈ کی۔ پس جولڑکی مسلمان کے ہو کر آزاد خیال ترک کر چکی ہو نماز پانچ وقت کی کو تو ہرگز بھروسہ نہ کیجیے اوپر جذبۂ وفا اور مہربانی اس کے کی کیونکہ البتہ تحقیق جولڑکی بھلا سکتی ہے فریضہ خدا وہ بھلا دے گی فریضۂ وفا و احتیاط کو۔ اب کیا کیا اشارے حکیمانہ ہمارے جھٹلاؤ گے؟ مبارک فرمائے اللہ اس عید ہذا کو تمام مسلمانوں کو کہ کہا ہے۔

میلادِ اعظم

اے محترم بیوقوف لوگو! سمجھو تم تعلیمات کو نبیؐ پاک ہمارے کے اگر ہو تم عقل کے رکھنے والے۔ کیونکہ البتہ تحقیق نہیں تشریف لائے تھے نبی اعظمؐ ہمارے مگر واسطے محبت پیدا کرنے اللہ مہربان کی بیچ دلوں انسانوں تمام کے۔ پس جس نے کہ قبول کیا پیغام آپ کا دن حشر کے ہوگا وہ نجات پانے والا آگ دوزخ سے اور جو شخص کہ لڑتا ہے وہ ساتھ بھائی اپنے کے اور نہیں ڈرتا وہ نقصانات فساد اور جھگڑے سے تو ہوگا وہ حشر کے دن پر پریشان بہت۔ اگرچہ بہت سے پتلون پہننے والے مسلمان محبت رکھتے ہیں ساتھ رسولؐ پاک ہمارے کے بہت مگر نہیں نماز پڑھتے وہ ساتھ پابندی کے۔ پس جس نے کہ نہ نماز پڑھی پابندی سے اور محبت کی اس نے رسولؐ پاک سے تو محبت اس کی ہوگی جھوٹ۔ پس اگر دعوئ محبت نبیؐ پاک علیہ السلام کا رکھتے ہو تو زندگی مانند نبیؐ پاک کے بناؤ۔ اے تجارت کرو اور مت فساد کرو ساتھ ہندوؤں اور سکھوں کے، بھی کیا ہو گیا ہے تم کو اے مسلمان ماسٹر و اسکول کے کہ نہیں باز رکھتے تم مسلمان طلبا کو لباس انگریزی سے اور کیوں نہیں چھین

لیتے تم نو جوان طلبا سے پاجامے چست زیادہ کے سبب سے لباس نازک اور چست کے ہوتے
جاتے ہیں مزاج نو جوان طلبا کے مانند زنان بازاری کے۔ دراں حال یہ کہ چاہیے اورالبتہ تحقیق
چاہیے مزاج مردانہ اور بہادرانہ طلبا کو کیونکہ اگر بیچ زمانہ طالب علمی کے پہنیں گے طلبا ہمارے لباس
کھدر کا تو بہادر اور جفاکش ہوں گے وہ بیچ زمانہ لیڈری اپنی کے اور استعمال کیا انھوں نے چست
پاجامہ اور بال صفا پاوڈر بیچ اسکولوں کے تو لیٹ جائیں گے وہ مانند عدم تشدد گاندھی صاحب کے بیچ
شروع موسم جوانی اپنی کے اگر چہ ڈالے جائیں گے بیچ دوزخ کے وہ ماسٹر اسکولوں کے جو نہیں منع
کرتے طلبا اپنے کو اس سے کہ کاٹ ڈالیں وہ بال سر انگریزی اپنے سے کہ سبب سے بالوں سر کے
پیدا ہوتا ہے زنانہ پن بیچ طلبا نو جوانوں کے۔ پس شرم بہت واسطے ایسے ہیڈ ماسٹروں کے
ہو جیو کہ بے پرواہ رہتے ہیں وہ اخلاقی اصلاح سے طلبا کی مگر اے بے حیا بہت ہوتے ہیں طلبا اس
زمانے کے اور نہیں ادب کرتے وہ استادوں اپنے کا سبب بے تکلفی ہاکی اور فٹ بال کے۔ پس
کیا مجاہدین دروز وشام کے اور کیا مجاہدین ریف وجاوا کے اور کیا مجاہدین چین کے رہیں گے یہ
سب ناکام سبب سے نحوست ہندو مسلم فسادات کے۔ پس جس جماعت سے کہ جاتا رہا لباس قومی
اس کا بیچ دنیا کے رہے گی غلام اور طلبا جس قوم کے ہوں گے نازک مزاج مانند عورتوں کے ہو گی وہ
قوم ذلیل بہت بیچ دنیا کے۔ پس وہ بہتر ہے واسطے کانگریس مدراس کے کہ نہ پاس کرے وہ مبلغ
ایک ریزولوشن مگر یہ کہ ارکان تمام انڈین نیشنل کانگریس کے ہمراہ ڈاکٹر انصاری کے بیچ اس سال
ہذا کے اتفاق کرائیں بیچ ہندو مسلمانوں کے مقرر کر کے "اتفاق کمیٹیاں" بیچ ہر شہر اور ہر قصبہ کے اور
جو تجویزیں پاس کیں کانگریس نے مانند سالوں گزرے ہوئے کے تو نہ کامیاب ہو گی کانگریس اوپر
اسی جگہ کے حکیموں نے کہا ہے:

یہ کیسا شور ہے کہ بیچ زمانہ ہوائی جہازوں اور قمر کے دیکھتا ہوں میں
یہ کیسی یوروپی چائے ہے کہ مسلمانوں کو پیتا ہوا بدلے نماز فجر کے دیکھتا ہوں میں

پس شتابی کر دو تم اے ہندو دو مسلمانوں واسطے اتفاق کے کہ ورنہ مسلمان بنا دے گا اللہ تم
دونوں کو کیونکہ بیچ دنیا کے عمدہ ہے کرنا اتفاق کا، اب سبب سے برکت غلامی نبیؐ پاک ہمارے کے۔

تنخواہ بڑھادے اللہ ہماری برابر تنخواہ ڈپٹی کلکٹروں کے۔ رحمت خدا کی اوپر نبیؐ پاک ہمارے کے ہوجیو کہ کہا ہے۔

گلابی اردو میں جشن عید

اے قرض کے لباس سے عید کرنے والو! قسم ہے تندرستی مسٹر چرچل کی کہ نہیں کی فضول خرچی اوپر عید خاکی اپنی کے تم نے بھی بیوی بچوں تمھارے نے بھی بعد نماز عید نہیں خرید کی شیرینی وغیرہ تم نے بے شمار روپیہ کی مگر سبب سے غفلت علمائے ہند کے کہ تحقیق جب خوب لکھے فضائل رمضان اور عید کے علمائے سابق نے بیچ زمانے نول کشور پریس کے تو ثواب سمجھنے لگے بے تعلیم مسلمان خرچ رمضان اور عید کے علمائے کو مگر کسی نے نہ بتایا ان کو کہ ہر فریضہ اسلام کا بھی ہر تہوار مسلمانوں کا موقوف رکھا گیا ہے اوپر استطاعت بھی اوپر تقاضوں وقت حاضر کے۔ پس جبکہ دندنا رہے ہیں مسٹر چرچل اوپر ایران کے اور بے روزگار کہہ رہے ہیں مسلمانان ہند خود کو تو فرض تھا لیڈروں مسلمان علما اور صوفیا ان کے کا کہ باز رکھتے اسے منع کرتے، اسے روکتے وہ مسلمانوں بے تعلیم اور مسلمانوں بے مقدرت کو خرچ بے اعتدال رمضان اور عید سے مگر جب بقلم خود مسلمان لیڈر بھی مسلمان ائمہ مساجد بھی علما بھی صوفیا ڈٹے ہوں عبائیں اور عمامے سلک کے تو بے خبروں تک کیا پہنچے جیسا کہ کہا ہے کہنے والوں شیراز میں سے ایک نے:

خلاف پیمبر اور خلاف حالت حاضرہ کے جس نے کہ راستہ اختیار کیا ہرگز اوپر عید دن بڑے اور کوٹھیوں بلند کے نہ پہنچے گا۔

امابعد اے بے تنظیم مسلمانو ہندوستان ہذا کے۔ قسم ہے بزرگی لال بکرے ہمارے کی کہ بیچ معاملہ تیل ایران کے جیسی کہ غلط عجلت کی ایرانیوں نے ویسے ہی عجلت کی حکومت انگلستان نے خلاف وقار جنگی اپنے کے۔ پس معلوم ہوا کہ کھٹ گیا اسے بے حد کم ہو گیا وقار، تدبر اور ملکہ سیاست بین الاقوامی قوم انگریز کا بہ سبب شدید نقصانات جنگ جرمنی کے بھی بہ سبب نکل جانے نوآبادیوں عظیم کے۔ بنا سپتی گھی کھلائے اللہ تعالیٰ نے بھی ملاوٹی تیل وزرائے انگلستان کو مانند

ہمارے اگر چہ نہیں مثال مار سکتا کوئی جفاکشی اور بہادری سپاہیوں شمالی کوریا کی مگر یہ کہ ابھی باقی ہیں لمبے آزمائش باشندوں کو ریا کے بھی بعض دوسرے علاقوں ایشیا کے بہ سبب اس کے کہ اکثر باشندے ایشیا کے ظالم و جابر کہتے رہتے۔ یورپ والوں خاص کیے گئے انگریزوں کو مگر بقلم خود نہ سکے وہ بہ سبب استعداد ناقص اپنی کے ترقی کرنا بیچ سائنس بھی بیچ ایجادات کے اور اس کوتاہی ہذا اپنی کو سبب بتاتے ہیں اب بھی غلامی کا دراں حال یہ کہ غلبہ یورپ والوں کا علامت ہے ناقص استعداد ایشیا کی کا مگر کون سکے سمجھنا ان نکتوں بھی رموز علمی ہمارے کا سامنے تماشوں سنیما اور سامنے ٹھمریوں ریڈیو کے۔ پس اے اخباروں اردو کے چندہ کھا جانے والے ایجنٹو! ہلاکت ہے واسطے تمھارے بھی واسطے اولاد تمھاری کے اگر کھا گئے تم چندہ اے قیمت اخبار کی کیونکہ البتہ تحقیق آیا ہے بیچ کتابوں بزرگ دین اسلام کے کہ جو شخص کہ حق مارے گا دوسرے کا تحقیق حق مارا جائے گا اس کا مانند وفات حسرت آیات ہر ہٹلر اور مسولینی اور احباب ان کے کے اگر چہ بہت دن گذرے کہ نوش فرمانا شاہی کبابوں کا حضرت خواجہ حسن نظامی کا نہ سنا ہم نے۔ دراز کرے اللہ عمر ان کی اور رسی ظالم کی۔ پس جو لوگ اور لگائیاں کہ آگ بھڑکاتے ہیں جھگڑوں فرقہ وارانہ کی کم کر دے گا اللہ قدرت والا راشن ان کا بھی نہ ملے گی دوائیں اور ڈاکٹر و طبیب ان کو وقت مرض الموت کے کیونکہ نہیں ہے کوئی شک بیچ اس کے کہ جھگڑیں ہم سے چاروں بیویاں ہماری موافق حق جھگڑنے اپنے کے واسطے عمدہ اور شاہانہ لباس عید ہذا کے کیونکہ کیا شوہر بہت اور کیا بیویاں بہت دور ہیں علوم دین اسلام سے اور قریب ہیں غلط رسوم سے بے سبب خبری مسلمانوں نے بے تعلیم کے، مگر عجب ہم اور بکرا ہمارے کے معا اے فوراً مبلغ تقریر کی ہم نے خلاف قاعدوں تقریروں سرکاری یورپ کے کہ تحقیق اندر تقریروں سرکار یورپ کے نہیں اصلیت مگر برابر راشی کے اور جھڑکا ہم نے موافق جھڑکنے کوتوال کے کہ قسم ہے بے حسی دولت مندوں کی جو نہیں کام آرہے ہیں فاقہ کشوں کے نہ خریدیں گے اور البتہ تحقیق نہ خریدیں گے ہم لباس قیمتی واسطے عید ہذا کے کہ تحقیق نہیں ہے حق منانے عید کا ہے بیچ اس حال کہ دال فروخت ہو رہی ہے ساتھ قیمت مچھلی اور مکھن کے اور سبزی مل رہی ہے برابر قیمت موٹر اور سائیکل کے اور بکرا مل رہا ہے واسطے بلا قورمہ کے برابر قیمت جنگی جہاز کے اور بھاگے جا رہے ہیں مسلمان بے توفیق اور بے سامان طرف پاکستان کے مگر یہ کہ راہ

ماری تم نے سب کی شیطان راندے ہوئے۔راستہ بتادے اللہ تعالیٰ بجیرۂ روم اور طوفانوں اس کے کاغنڈوں فسادی کو بھی ان اخباروں تمام کو جو بھڑ کاتے ہیں مانند آگ بھڑ کنے والی کے غنڈوں اور فرقوں کو واسطے باہمی جھگڑوں کے مگر یہ ہیں فضلات زمین کے اے فضلات ناقص۔پس بدلے لباس شاہانہ عید کے اگر جمع کرو تم پیسہ مانند جمع کرنے سیٹھ جی سودخور کے کھا کر روٹی روکھی پھیکی ساتھ دال چنے کی کے تو دور ہوں تکالیف تمام تمھاری۔پس کیا ملک ایران اور کیا ملک کوریا اور چین اور مثل ان کے حاصل نہ کرسکیں گے منافع کامل اے منافع پورے جب تک کہ نہ پیدا کریں گے بقلم خود موجد و مدبر درجہ اولیٰ کے اندر زمین اپنی کے مگر عجب وقت بحران اور ہیجان باشندوں ایشیا کا کہ آسان سمجھا ہے مطالبہ آزادی کو۔محفوظ رکھے اللہ تعالیٰ ان بے استعداد عوام اور لیڈروں غیر مآل اندیش ان کے کو چالاکیوں مدبرین یورپ سے بھی توفیق دے اللہ مہربان قدرت والا مسلمانوں ہند کو اے توفیق اتحاد باہمی واتفاق باہمی کے ساتھ برکت اس خاکی عید 1953 کہ کہا ہے:

علامت ہے افلاس عقل کی جب بڑھ جائے شاعری۔مفید ہے اگر بڑھ جائے بیچ ظالم کے قہر والے انصافی۔درست کیجیے قافیہ ہمارا اے محورر ہنے والوں اندر قافیوں کے بیچ زمانے افلاس کے زیادہ حد ادب اور عید کی۔

(روزنامہ ''جمہوریت'' عید نمبر، 7 جولائی 1951)

◆◆◆

نکات

حصول آزادی کی کوشش میں وہ جماعت کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی، جس کے 95 فیصدی افراد لفظ آزادی کے معانی اور مطالب سے بے خبر ہوں۔

◆

طاقت ور جماعت یا قوم اُسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب نوجوانوں کے اخلاق کو طاقت ور بنایا جائے اور اخلاق کی حفاظت کا بہترین ذریعہ ابتدائے شباب کی شادی بھی ہے۔

◆

دنیا کی عظیم الشان لوگوں کی سوانح عمریاں رات دن مطالعہ میں رکھنے سے انسان مصائب اور مشکلات کے وقت بہادر ہو جاتا ہے۔

◆

محض خیالی اور جذباتی ناولوں، افسانوں اور اشعار کے مطالعہ میں جو وقت صرف ہو اسے صنعت یا ایجاد و اختراع میں صرف کرنا زیادہ مفید ہے۔

◆

غیر قوموں کے تمدنی اور معاشرتی اثرات کو قبول نہ کرنا ایک ایسی فتح ہے جو میدانِ جنگ کی فتوحات سے افضل و اعلیٰ ہے۔

◆

تحریر میں غلط الفاظ، غلط تراکیب اور غلط جملوں کو لکھ کر یہ کہنا کہ 'غلط العام فصیح' علمی کمزوری ہے۔ اربابِ علم کی شان 'غلط العام' کی تقلید سے ذلیل ہوتی ہے۔

◆

صحتِ زبان یا اصلاحِ زبان کے لیے سند یا استناد کا جو طریقہ آج تک جاری رہا وہ یہ ہے کہ ہر دلیل اور مثال اردو کے حصہ نظم سے پیش کی جاتی ہے، لیکن اب اردو کے حصہ نثر سے بھی استناد کی ضرورت ہے، اس سے اصلاحِ زبان میں آسانی ہوگی۔ گو یہ رسم کے خلاف ہے، مگر مفید بدعت بھی کبھی کبھی جائزہ ہوا کرتی ہے۔

◆

شاعر اور نثر نگار کو ہمیشہ اپنے زمانے کے محاورات، مصطلحات، روزمرہ اور بول چال کو لکھنا چاہیے۔ اس سے زبان کی ترقی اور وسعت کا ہر دور متعین ہو سکتا ہے۔ یہ طریقہ نہایت لغو اور غلط ہے کہ 1929 کا شاعر یا نثر نگار ولی دکنی یا میر امّن دہلوی کی تحریروں سے اصلاح لے۔ پس استناد یا سند کے لیے بھی اپنے ہی دور کے شعرا اور مستند ادبا موزوں ہیں۔

◆

جس ملک میں کثیر المقاصد انجمنیں بکثرت ہوں اس امر کی علامت ہے کہ اس ملک کے باشندوں میں وحدتِ خیال نہیں اور جن باشندوں میں وحدتِ خیال نہ ہو ان میں وحدتِ عمل بھی نہیں اور جن لوگوں میں وحدتِ عمل نہ ہو ان کی قومی موت یقینی ہے۔

◆

جو قوم کسی دوسری قوم کے اخلاقی، تمدنی، معاشرتی اور فکری آثار و اثرات کو شدت سے پسند کرتی ہو وہ اس کی غلامی کو باعثِ عار نہ سمجھے گی۔

◆

جس قوم کے بچے ابتدائی عمر سے ناز و نعم میں پلے ہوں اس کے جوانوں میں عیش پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوگی اور جب نو جوان میں عیش پسندی ہوگی تو ان میں بے حیائی اور بے غیرتی یقینی ہوگی اور جب بے غیرتی پیدا ہو جاتی ہے تو انسان اپنے خاندان، اپنے ملک اور اپنی قوم کی عزت و ناموس کی حفاظت سے عاری ہو جاتا ہے۔

◆

جن خاندانوں میں نوکر اور خدمت گار معتمد یا منصرم بنا دیے جائیں سمجھو کہ اس خاندان میں بے حیائی اور بے غیرتی اب پھوٹ پڑے گی اور اس خاندان کا ایک ایک فرد بے حمیّت اور بے غیرت ہے۔ دولت مندوں میں یہ وبا عام ہے۔

◆

حساس اور ذی ہوش آدمی کی صحت ہمیشہ خراب اور قویٰ مضمحل رہتے ہیں اور بے وقوف، بدعقل اور بے دماغ آدمی ادنیٰ سی فارغ البالی سے بے حد و بے قیاس توانائی اور فربہی کا مالک بن جاتا ہے۔

◆

وطن ایک ایسی محدود سر زمین کو کہتے ہیں جہاں آدمی ہنر مند ہو کر بے ہنر ہو جاتا ہے اس لیے ہنر مند وہی ہے جو اس ذلیل سر زمین کو ٹھکرا کر خدا کی پھیلی ہوئی سر زمین کے جس حصے میں عزت پائے چلا جائے۔

◆

دوست کے معنی ہیں ایک فریب دینے والا انسان جو اپنی اغراض کی تکمیل کے لیے

ہمارے ساتھ ہے، مگر ہم اپنی بیوقوفی سے اسے پہچانتے نہیں۔

◆

صحت کی حفاظت وہی کرسکتا ہے جو بیماری کے خطرات سے ڈرتا ہو اور ہولناک بیماریوں میں وہی شخص مبتلا ہوتا ہے جو بیماری سے نہیں ڈرتا۔

◆

جو شخص کہ اوقات کا پابند نہ ہو سمجھو کہ وہ ہندستانی ہے۔

سسرال

عین اس وقت جبکہ یہ کتاب مسودہ کی صورت میں مکمل ہو چکی تھی۔ ہم نے صوبہ سرحد کے جدید الشیوع اور بلند پایہ رسالہ ''ادیب پشاور'' کے فروری نمبر کے لیے ''سسرال'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، لیکن مضمون روانہ کرنے کے بعد کتاب ہذا کی نسبت سے اس کا یہاں نقل کر دینا بے حد ضروری سمجھا گیا ہے، اس لیے مذکورہ مضمون کے کٹے کٹائے مسودہ سے عام فائدے کے لیے یہاں اُن حالات کو نقل کیے دیتے ہیں جو اس موضوع سے متعلق ہیں۔ چنانچہ وہ جو کہا ہے کہ ''کافر برحق ہے اور کرنے والا جادو'' سو بالکل اسی طرح یہ بھی برحق ہے کہ غلامی کی آب دہوا میں پل کر جو لوگ جوان ہوتے ہیں خواہ وہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا ''قومی ترانہ'' پڑھ لیں یا وہ ''مسدس حالی'' حفظ یاد کر لیں، رہتے ہیں ہر حال میں خستہ وخوار، نہ جہالت ان کا پیچھا چھوڑتی ہے نہ وہ جہالت کا، نہ افلاس سے وہ محفوظ رہتے نہ بیماریوں سے۔ ان میں سینما پر سینما ہوتے ہیں کہ وقت اور دولت تباہ کرنے کے لیے کھلتے جاتے ہیں اور تھیٹر پر تھیٹر ہوتے ہیں کہ قائم ہوتے جاتے ہیں۔ حالانکہ کہنے میں یوں آتا ہے کہ ہندستانیوں کی اصلاح وترقی کے لیے اسلامیہ ہائی اسکول بھی ہیں اور محمڈن کالج بھی، انجمن حمایت الاسلام لاہور بھی ہے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھی۔ گر آپ غلامی اور آزادی کا فرق معلوم کرنا چاہو تو ایک بڑے سے میدان میں یورپ کی تمام قوموں کو جمع کرو اور انھیں کے برابر برابر افریقہ کے حبشیوں، ایشیا کے ہندستانیوں اور امریکہ کے میکسیکوئیوں کو کھڑا کر دو، پھر ذہنی اور خیالی مقابلہ کرو تو رذالت، پستی، خوف، وحشت، نفاق، منافقت اور قناعت تو نظر آئے گی حبشیوں اور ہندستانیوں میں

اور فتح وظفر مندی، اصلاح وترقی، ایجادو اختراع، ہمت واولوالعزمی نظر آئے گی یورپ کی قوموں میں۔

تو بس ایسا ہی کچھ نقشہ ہے اپنے ہندستان میں رہنے والوں کی صورت، سیرت، لباس، زبان، مذہب، تہذیب اور معاشرت یا اخلاق کی پستی کا اور ان میں سے ہر چیز ہلاک ہورہی ہے جہالت اور رسومِ بد کے ہاتھوں، مگر وہ جو کہا ہے کہ ''ساون کے اندھے کو ہمیشہ ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے'' سو رسوم وعادات کے لحاظ سے وہ ایم۔اے پاس ہو کر بھی باوادادا کی تاریک اور خلافِ عقل رسوم وعادات کے یوں پابند ہیں گویا انھوں نے دماغی لحاظ سے آج تک ایک اِنچ بھی ترقی نہ کی۔ تعلیم تو پاچکے یورپ کے بہترین اور ترقی یافتہ دماغوں اور ارفع واعلیٰ علوم کی مگر عادات ورسوم کے اعتبار سے وہ 308 قبل مسیح کے زمانے ہی میں دھرے ہوئے ہیں اور مرتے ہیں تو باوادادا کی رسوم پر اور دم بھرتے ہیں تو جاہلانہ رسوم وعقائد کا۔

پس ہندستانیوں کی ایسی ہی ذہنی پستی اور دماغی تاریکی کا ایک گھناؤنا نمونہ ''سسرال'' بھی ہے جسے اگر اکبرآباد کی سونٹھ کی منڈی کا پاگل خانہ کہا جائے تو غلط نہیں۔ آپ ہندستان کے طبقۂ اعلیٰ کے سسرال کا تذکرہ تو اس لیے جانے دیجیے کہ طبقۂ اعلیٰ کے افراد بہ لحاظ اصول زندگی ایک طرح کے ''بے قید لوگ'' ہوا کرتے ہیں کہ نہ ان کے ہاں اصول اصول نہ ضابطہ ضابطہ، نہ شرم شرم ہے نہ ندامت ندامت، نہ اخلاق پر کوئی احتساب نہ اعمال پر کوئی پابندی، بس جس وقت جو چاہا کھایا، جب چاہا تھیٹر میں جا بیٹھے، جب چاہا سنیما میں، جب چاہا سو گئے، جب چاہا بیدار ہو گئے۔ بس یوں سمجھو کہ ان کے ہاں اللّے تللّے آتا ہے اور اناپ شناپ خرچ ہوتا ہے۔ اپنے سے کم مرتبہ انسان کو یہ لوگ ''بے منہ کا جانور'' سمجھتے ہیں اور اپنے سے کم دولت مند آدمی کو لنگور نہیں تو گدھا۔ البتہ برطانیہ کی گورنمنٹ کے کانسٹبل تک سے یوں کانپتے ہیں جیسے طالب علمی کے زمانہ میں ہم آپ اللہ بخشے ''بڑے مولوی صاحب'' سے ڈرتے رہتے تھے۔ اس لیے قابلِ ذکر و بحث طبقہ تو ہوا کرتا ہے طبقۂ ادنیٰ عرف غریب لوگ کہ انھی لوگوں میں مذہب، اخلاق، معاش ومعاشرت اور تمدن وتہذیب کی جملہ پابندیاں نظر آتی ہیں۔

البتہ بعض حالات میں اس طبقۂ ادنیٰ کے اندر بعض رسوم وعادات اس درجہ سخت وشدید اور اس درجہ غلط صورت میں پائی جاتی ہیں کہ ان کی اصلاح سے غفلت اصل میں ہندستانیوں کی اجتماعی

موت کے ہم معنی ہے۔ چنانچہ ایسی ہی مہلک اور تباہ کن چیزوں میں سے ایک "سسرال" بھی ہے۔ بظاہر تو سسرال کہتے ہیں شوہر والے لوگ بیوی کے خاندان کو اور بیوی والے لوگ شوہر کے خاندان کو، مگر اصل یہ ہے کہ جن خاندانوں کو سسرال کہا جاتا ہے وہ انسانی اوقات، دولت، اخلاق اور دماغ کی تباہی کے ایسے مرکز ہیں کہ افریقہ جاتے وقت خدا ہر ہندستانی کو ان سے محفوظ رکھے۔

ہندستانیوں میں "سسرال" ایک ایسا مقام مقدس اور مزار پاک سمجھا جاتا ہے جہاں انسان جائے تو قیمتی اور پاک کپڑے پہن کر، سلام کرے تو جھک کر، بولے تو بڑے تہذیب سے، بیٹھے تو بڑی لیاقت سے، دیکھے تو کنکھیوں سے اور جمائی لے تو منہ بند کر کے۔ پھر اگر اپنے خسر کو جھک کر سلام کرے تو ساس کو بھی جھک کر اور سالی کو بھی جھک کر اور جو سسرال کے جملہ رشتہ داروں کی "سسرالی صرف ونحو" کر ڈالو تو ذیل کے افراد خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن کی تعظیم بجالانا داماد کا بھی فرض ہے اور بہو کا بھی۔ مثلاً خسر یا ساس کے ساتھ صرف ایک لفظ کا اضافہ کر دیجیے بزرگ لوگ ساس کے ساتھ نانی ساس، دادی ساس، پھوپھی ساس، چچی ساس، ممانی ساس اور خالہ ساس۔ یہ اور ان سے دو چند سہ چند چہار چند بلکہ "سو چند" افراد اور ہوں گے جنھیں سسرال میں جا کر آداب بجالانا پڑے گا۔ پھر اگر آپ اتنے سلاموں سے تھک کر چاہیں کہ ذرا سانس قائم کرلیں تو یہ اور جگہ تو ہوسکتا ہے لیکن سسرال میں اس لیے نہیں ہوسکتا کہ یہاں کے ضابطہ اور قانون کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ مثلاً آپ کے سالے بھی ہوں گے اور سالیاں بھی۔ پس یہ سالے اور سالیاں آپ سے عمر، عقل، تمیز، تہذیب اور مرتبہ میں چاہے کتنے ہی کم بلکہ کمتر ہی کیوں نہ ہوں لیکن اگر یہ سب آپ کی بیوی سے فقط عمر میں بڑے ہیں تو آپ پر ان سب کو جھک کر سلام کرنا فرض ہوگا۔ اگر آپ کی بیوی انھیں بھائی جان کہہ کر پکارتی ہے تو آپ ان کے باوا کی عمر کے ہوکر بھی انھیں بھائی جان ہی کہیں گے۔ اگر آپ کی بیوی آپ کی سالی کو "آپا جان" کہتی ہے تو آپ بھی "آپا جان" ہی کہیں گے تب تو شریف داماد ورنہ جہنمی۔ یہی حال آپ کی بیوی کا ہوگا کہ وہ آپ کے خاندان کے جملہ ارکان کی چھوٹی لونڈی قرار دی جائے گی جس کا احترام نہ کرے گی نافرمان، بدتمیز، سرکش اور موقع ملے گا تو حرافہ تک کہہ دی جائے گی اور حق سمجھا جائے گا جو کچھ اس کے لیے کہا جائے گا۔

واضح ہو کہ اس قسم کی فرماں برداری اور چھوٹا پن تو آپ کو بادشاہوں کے سسرال میں بھی

ملے گا اور تاریک خیال مولویوں کے گھرانوں میں بھی، لیکن اگر آپ عقل اور مزاج کے حساب سے ذرا تاریک خیال سے، ذرا مفلس سے اور ذرا جاہل سے ہوں گے تو پھر آپ کی حیثیت سسرال میں وہی ہوگی جو یورپ کے ہوٹلوں میں افریقہ کے حبشی انسانوں کی ہوا کرتی ہے۔ یا شریف ہندستانیوں کی محفل میں رنڈیوں کی یا ہندستانی افسروں کی نظر میں اپنے ماتحت ہندستانیوں کی یا کوتوالوں کی نظر میں مشتبہ لوگوں کی یا مار کھائے ہوئے طالب علم کی نظر میں اپنے ماسٹر کی یا ہندستانی ٹکٹ کلکٹروں کی نظر میں ہندستانی مسافر عورتوں کی یا ریلوے پولیس مین کی نظر میں بے ٹکٹ سادھوؤں کی یا موٹے مہاجن کی نظر میں ایم۔ اے پاس قرضدار کی یا مولانا ثناءاللہ امرتسری کی نظر میں قادیانیوں کی یا عربی گھوڑے کی نظر میں بریلوی خچر اور گدھے کی یا اردو اخبارات کے ایڈیٹروں کی نظر میں مضمون نگاروں کی یا سرحدی پٹھانوں کی نظر میں لکھنؤ والوں کی یا آج کل کے مسلمانوں کی نظر میں ہندو کی اور ہندو کی نظر میں مسلمان کی یا گشت کرنے والے پولیس مین کی نظر میں بے روشنی کے راہ گیر کی۔

القصہ سسرال نام ہے ان کی کم یا زیادہ افراد کی فرماں برداری، غلامی، محکومی، اطاعت اور عبودیت کا جو شوہر کے رشتہ دار ہوں یا بیوی کے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بیوی کے لیے شوہر کے خاندان میں شوہر کی والدہ اور شوہر کی بہن بہت زیادہ قابلِ احترام و اطاعت ہیں کہ یہی دونوں ہوتی ہیں جو بیوی کے حق میں ہلاکو خان اور پنجاب کا جنرل ڈائر ہوتی ہیں لیکن شوہر کے لیے سسرال کے ہر فرد کی ناز برداری، غمخواری، دلداری اور تابعداری جس کا خلاصہ انسانی بھی ہے اور شرافت کی علامت بھی اور شوہر کے ذمہ سسرال کے یہ وہ فرائض ہیں کہ جو علی گڑھ میں یونیورسٹی بنا کر نہ کم کیے جا سکے نہ لندن میں جا کر تعلیم یافتہ ہونے سے دور ہوئے بلکہ اب جو یورپ کی غیر قومی عادات ہندستانی مسلمانوں نے غلامی کے اثر سے اختیار کی ہیں ان کے حساب سے بیوی کو گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کا رتبہ دیا جا رہا ہے یعنی عورت کو مرد کے برابر جو درجہ مل رہا ہے اس کے اعتبار سے تو اب شوہر کے لیے بیوی کا خاندان ایک طرح کا ''ہائی کورٹ'' ہو کر رہے گا جہاں بادشاہ اور چپراسی سب برابر سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں تک تو تھا معاملہ ''مراتب'' کا اب مرتبہ آتا ہے ''فرائض کا'' چنانچہ سسرالی فرائض کی یوں تقسیم کی گئی ہے کہ اگر بیوی کا کوئی رشتہ دار اس کے شوہر کے گھر جائے تو اسے چاہیے کہ وہ لڑکی کے نام سے اپنے ساتھ مٹھائی، میوہ، زیور یا کمبل ہی سہی مگر تحفہ ضرور لے جائے اور لڑکی کے سسرال میں سوائے پان کے

اور کوئی چیز نہ کھائے نہ لڑکی کی سسرال میں جا کر چارپائی پر لیٹ جائے وغیرہ۔ بخلاف اس کے اگر شوہر اپنی سسرال یعنی بیوی کے رشتہ داروں میں جائے تو ایک ایک فرد کو جھک کر سلام کرے اور خیریت دریافت کر کے اپنی بیوی کو آ کر سنائے۔ اگر اسے معلوم ہو کہ اس کی سسرال کا کالے رنگ والا کتا کہیں بھاگ گیا ہے تو وہ اس کی تلاش میں پہلے محلے کے ایک ایک مکان کو چھان ڈالے پھر کوتوالی میں جا کر کتے کا حلیہ لکھائے، پھر اخبار ''پارس'' لاہور اور اخبار ''پائنیر'' الہ آباد میں گمشدہ کتے کی تلاش کا اشتہار چھپوائے اور جو معلوم ہو کہ یہ کتا اکبر آباد کے محلّہ نائی کی منڈی میں موجود ہے تو یہ وہاں جا کر اسے اپنے ساتھ لے آئے اور راستہ میں اسے جوتا تو مارے مگر آہستہ سے۔

پھر اگر بیوی کے رشتہ داروں میں سے کوئی ایک بیمار ہو جائے تو داماد کو چاہیے کہ نوکری چھوڑ کر، گے، ڈولی اور تانگہ ساتھ لے کر پہلے اپنے گھر جائے، وہاں سے اپنی بیوی کو ساتھ لے کر بیمار گھر جائے اور بیمار کی چارپائی کے اوپر یا نیچے یا قریب یوں بیٹھ جائے گویا مارے غم کے اب وہ خود مرنے والا ہے۔ کچھ تھوڑی دیر میں وہ بیمار کا تھوک بھی صاف کرے اور بستر بھی اور جو بیماریوں سے بھی اچھا نہ ہو تو اسے حکیم محمد جمیل خاں کے پاس دہلی لے کر جائے اور جو حکیم محمد اجمل خاں صاحب اس وقت ہوں رامپور میں ہوں تو یہ سیدھا رامپور پہنچے اور جو یہ بیمار راستہ ہی میں ''جان بحق تسلیم'' ہو جائے تو پھر یہ داماد کفن دفن کے بعد بیوی کے ساتھ ہم آواز ہو کر اس زور سے روئے کہ سارا محلّہ جان لے کہ داماد بھی رو رہا ہے اور بیوی بھی۔ اسی طرح اگر داماد کے خسر صاحب کی پنشن رُک جائے تو پھر داماد انھیں عمر بھر روٹی بھی اپنے پاس سے کھلائے اور حقہ بھی پلائے۔ اگر سالے آوارہ ہوں تو انھیں اپنے مصارف سے تعلیم دلائے، نوکر رکھائے اور شادی بھی کرائے۔

یہ تو تھا نمونہ مختصر سے فرائض کا جو انسان کے وقت، دماغ اور دولت کی تباہی کا باعث ہیں۔ اب ان کے بعد مرتبہ ہے ''معاملات'' کا سو ان کا قانون یہ ہے کہ اگر کوئی داماد اپنی سسرال میں زیادہ رہ جائے، سسرال والوں کو زیادہ مہمان رکھے یا سسرال والوں سے زیادہ ربط و علاقہ رکھے تو اس کی ماں اور بہن اس سے ناراض ہو کر کہیں گی کہ:

تو سسرال کا کتا ہے۔

جورو کا مزدور ہے۔

پھر ہمارے ساتھ کیوں رہتا ہے؟
تو ہمارے گھر آنے کی پھر کیا ضرورت ہے؟
اور سن کہ آج تیری بیوی نے گالی دی۔
اور سن کہ آج تیری ساس نے لٹھ مارا۔
اور سن کہ آج تیرے سسر نے جوتا مارا۔

یہی حال سسرال والوں کا ہوگا جب آپ جایئے گا تو خسر، ساس، سالے اور سالیاں آپ کو گھیر کر بیٹھ جائیں گی اور کہیں گی کہ:

آپ کی والدہ نے ہماری بہن کے ساتھ یہ کیا؟

آپ کی بہن نے ہماری بہن کو آج صبح سویرے آنکھ دکھائی تو آپ ہی بتایئے۔ پھر ہم اپنی لڑکی کو آپ کے گھر کس طرح رکھیں۔

تو آپ اپنے ماں باپ سے علاحدہ کیوں نہیں ہو جاتے؟ یہ ہمارا گھر موجود ہے۔ آپ ہی مالک ہیں آج ہی سامان اٹھا لایئے۔

تو پھر ہماری لڑکی کو طلاق دے دیجیے اور مہر کا روپیہ لکھ دیجیے۔

یہ اور اسی قسم کے بے شمار حالات اور رسوم ہیں جو سسرال یا سسرالوں میں موجود ہیں اور تقریباً 95 فیصدی خاندان سسرال کی جاہلانہ گرفت میں جکڑ کر یوں تباہ ہو رہے ہیں کہ اگر سسرالوں کی اصلاح پر جلد توجہ نہ کی گئی تو مسلمانانِ ہند کی اجتماعی اور اخلاقی زندگی کا آخری آغاز اسی جگہ سے ہو کر رہے گا۔

مگر آپ یہ نہ سمجھ لیجیے کہ ملّا رموزی صاحب کا سسرال بھی ایسا ہی تاریک خیال اور رسوم کا پابند ہے اور اسی لیے ملّا صاحب نے یہ مضمون لکھا ہے۔ الحمدللہ کہ ہمارا سسرال سب سے اچھا، سب سے بہتر اور سب سے بلند و برتر ہے۔ خدا ہمیں اور ہمارے ننھے میاں کی والدہ کو مبارک کرے۔ آمین!

ایشیا کی بیوی

ایشیا انسانی آبادی یا خشکی کا سب سے بڑا حصہ ہے۔اس کے تین جانب بڑے بڑے دریا ہیں۔شمال میں ''بحر شمالی'' مشرق میں ''بحر الکاہل''، جنوب میں ''بحر ہند'' اور مغرب میں ''بر اعظم'' اور افریقہ ہے۔اس کے شمال میں ایک بڑا نشیبی میدان بھی ہے۔دوسرے چھوٹے چھوٹے میدان بھی بکثرت ہیں۔ایشیا کے بیچ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک پٹی پہاڑوں کی ہے۔یہ پہاڑ مشرق میں بہت چوڑے ہیں اور بیچ میں تنگ ہیں اور پھر مغرب میں پھیل گئے ہیں۔اس کے آس پاس سمندر اور جزیرے بھی ہیں۔سب سے زیادہ مشہور جزیرے ملک جاپان میں ہیں۔اس میں آتش فشاں پہاڑ بھی ہیں۔یہ اس قدر بڑا حصہ زمین ہے کہ اس کا وسط حصہ سمندر سے بہت دور ہے اس لیے اس میں جاڑے کے موسم میں زیادہ سردی اور گرمی کے موسم میں زیادہ گرمی ہوتی ہے اور بارش کم ہوتی ہے۔ایشیا کے صحیح موسمی اثرات کو آسانی سے بیان نہیں کیا جاسکتا،اس کے جنوب مشرق میں تیز، خشک اور تر موسمی ہوائیں چلتی ہیں،مگر کل ایشیا کی آب وہوا غیر معتدل اور مختلف ہے اسی لیے اس کے کل باشندوں کی صحت وارجسمی کیفیت میں خاصا فرق ہے۔اس کی کل آبادی پچاسی کروڑ ہے (850000000) اور رقبہ ایک کروڑ ستر لاکھ مربع میل (17000000) ہے۔زمین کے اس حصہ کو انسانی آبادی کی کثرت کے لحاظ سے ''انسانوں کا جنگل'' بھی کہہ سکتے ہیں۔عام باشندے زیادہ تعداد میں جاہل،سست، وہمی،ضعیف الاعتقاد، بے ہنر اور عیش پسند ہیں۔اسی لیے یورپ کے ذی علم حوصلہ اور بہادر باشندوں نے اُن میں سے اکثر کو اپنا غلام بنالیا اوران کے ملکوں اور شہروں پر قبضہ کرلیا۔

اس کے مشہور ملک یہ ہیں چین، روس، عرب، جاپان، ایشیا کوچک، ترکستان، بخارا، افغانستان،ایران اور ہندستان۔

گو یہ تمام ممالک علاحدہ علاحدہ اور مختلف باشندوں سے آباد ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس میں یورپ کے بہادر باشندے کسی نہ کسی طرح غالب نہ رہے ہوں۔چنانچہ چین، ایران،افغانستان اور عربستان خصوصیت کے ساتھ اب تک ان باشندوں کے اثر میں دبے ہوئے ہیں اور ہندستان تو دوسو برس سے کل کا کل انگریزوں کے قبضہ میں ہے۔

1914 سے پہلے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان تمام ممالک کے باشندے آسمانوں پر کسی کام کے لیے چلے گئے ہیں اور دنیا میں ان کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے، مگر جب 1914 میں یورپ والوں کی آپس ہی میں عظیم الشان جنگ شروع ہوئی اور جو کامل پانچ سال تک مسلسل جاری رہی تو اس جنگ کے آسمانوں کو سر پر اٹھا لینے والے اثرات سے ایشیا والے بھی کچھ ہوشیار ہوئے اور انھوں نے یورپ والوں کے حالات کو بغور دیکھ کر سوچا کہ ہمیں بھی آزادی اور ترقی کے لیے کوشش کرنا چاہیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے پہلے ملک روس کے باشندوں نے اپنے بادشاہ اور اس کے کل خاندان کو قتل کر کے اپنی پنچایتی حکومت قائم کی اور یورپ کے باشندوں کے اثرات کو اپنے ملک سے بری طرح دور کر دیا اور اس میں اتنی سختی کی کہ اب روسی حدود میں یورپ کے باشندوں کو جاتے ہوئے لرزے والا بخار آتا ہے یا کالی کھانسی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ایشیا کوچک کے باشندوں نے یورپ والوں کو تلوار کے گھاٹ اتار کر نکال باہر کیا اور اب ان کی حد میں بھی قدم دھرتے ہوئے یورپ والوں کو کپکپی محسوس ہوتی ہے اور جمائیاں آنے لگتی ہیں۔ اس کے بعد ایران کے باشندوں نے اپنے عیش پسند بادشاہ کو بغیر طمانچے رسید کیے تخت سے اتار کر اپنے ہاں کے وزیر جنگ مارشل رضا خان کو اپنا بادشاہ قرار دیا پھر 1919 میں غازی امان اللہ خاں نے افغانستان کا بادشاہ ہو کر افغانستان کو تمام یورپ والوں سے آزاد کروایا اور دس برس تک اس ملک کی ترقی انتہائی تیزی سے جاری رہی، مگر 1928 میں جب امان اللہ خاں غازی بحیثیت آزاد بادشاہ افغانستان کے یورپ کی سیر کو گئے تو ان کے خلاف افغانستان کے جاہل باشندوں نے سازش کی اور جب وہ واپس آئے تو ان کے خلاف بغاوت کی اور وہ تخت و تاج چھوڑ کر یورپ کے ملک اٹلی میں چلے گئے۔ اب انہی کے ایک جرنیل صاحب افغانستان کے بادشاہ ہیں اور افغانی باشندوں نے جو ترقی کی تھی وہ اب سو سال کے لیے پیچھے رہ گئی اور نام صرف اتنا ہوا کہ ''افغانستان میں بغاوت ہو گئی تھی'' عرب میں بھی یورپ کے باشندوں کو نکالنے کے لیے کوشش ہو رہی ہے، مگر ملک چین نے ایک خوں ریز جنگ کے بعد 1929 میں یورپ کے باشندوں سے آزادی حاصل کر لی۔ اب ہندستان میں اسی قسم کی کوشش جاری ہے۔

چونکہ ایشیا میں مذکورہ بالا ممالک ہیں جن کے بے شمار و بے قیاس باشندوں کی بیویوں کے تفصیلی حالات سے یہ کتاب ''طلسم ہوش ربا'' کے برابر طویل ہو جائے گی اس لیے ہم ان ممالک کی

بیوی کے عام حالات کے نہایت مختصر نمونے پیش کرتے ہیں جو یہ ہیں:

روسی بیوی:

یہ بیوی ایشیا کی تمام بیویوں سے تعلیم، تمدن اور عام حالات میں آگے ہے۔ خصوصاً جنگی حالات کے لحاظ سے اس کا مرتبہ ایشیا کی دوسری عورتوں سے بہت بلند ہے۔

عام طور پر روسی بیوی نہایت معمولی رسوم کے ساتھ حاصل ہو جاتی ہے۔ موجودہ حکومت نے عیش وعشرت اور فضول خرچی کے ہر کام پر قانون کی بندش عائد کر دی ہے۔ ان عورتوں کا ماحول جنگی ہے، اس لیے جنگی قوموں میں ویسے بھی عیش پسندی کم ہوتی ہے بلاً دولت مند قومیں جنگی قومیں ہو کر بھی عیش پسند اور فضول خرچ ہو جاتی ہیں۔ لیکن روسی باشندے دولت مند نہیں بلکہ جنگی اور انتظامی حالات کے جلد جلد بدلتے رہنے سے ان میں کوئی عام اطمینان اور عیش کا جذبہ طاقتور نہیں ہوتا۔ روسی عورت بیوی بن کر امور خانہ داری کے لیے نہایت منتظم اور کفایت شعار ہوتی ہے اگرچہ روس میں بھی کلب، تھیٹر، سینما، رقص خانے، قہوہ خانے، ہوٹل اور دوسرے مواقع ایسے ہیں جن میں روسی عورت شریک ہو کر فضول خرچ بن سکتی ہے، لیکن یورپ میں رہنے اور یورپ سے قریب ہونے کے باعث وہ زیادہ تعداد میں تعلیم یافتہ ہے۔ ادھر نظامِ حکومت نہایت سخت ''سادہ'' ہے جس کے باعث گو وہ شوہر کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بڑے نخرے سے ہوٹلوں، کلبوں اور عام تفریح گاہوں میں چمکتی پھرتی ہے پھر بھی اس میں اپنے فرائض کو وقت اور مستعدی سے بجالانے کی عادت عام ہوتی ہے۔ اس میں اپنے بچوں، اپنے عزیزوں اور اپنے شوہر سے زیادہ اپنے ہم قوموں کی خدمت کا جذبہ عام ہے کیونکہ وہ تعلیم یافتہ ہوتی ہے اور اس کی پرورش ہی ایسے اصول پر کی جاتی ہے۔ وہ شوہر کے گھر صرف شوہر کی تنخواہ پر اکڑ کر دن بھر جھولا نہیں جھولتی بلکہ شفاخانوں، ہوٹلوں، دفاتر اور دکانوں میں ملازمت کرتی ہے اور بغیر گھونگھٹ کے شام تک سودا سلف بیچتی ہے، گھر میں رہتی ہے تو وہ صنعت وحرفت کے کاموں کو اختیار کرتی ہے۔ وہ بچوں کی بہترین تعلیم وتربیت میں طاق ہوتی ہے البتہ شراب اور ناچ کے معاملہ میں وہ ذرا بے ڈھنگی اور بے ہنگم معلوم ہوتی ہے، جنگی ذہنیت اور ہنر مندی کے باعث شوہر کے لیے اس لیے مصیبت ہوتی ہے کہ فوراً ''طلاق تک پہنچ جاتی ہے'' مگر وقت آنے پر وہ اپنے ملک وقوم کی اور اپنے

شوہر کی عزت کے لیے میدانِ جنگ میں خون بہاتی ہے اور کبھی ''اوئی بہن بھاگو'' نہیں کہتی، اسی لیے 1917 کے انقلاب میں اس نے میدانِ جنگ میں اور اُس سے پہلے 1514 اور 1916 تک جرمنی کی جنگ میں میدانِ شجاعت میں جس حوصلے، صبر واستقامت، جفاکشی اور دلیری سے کام کیا اسے سن کر ہمارے ننھے میاں کی والدہ اب تک کانپ جاتی ہے۔

قدم میں لم ڈھنگ، رنگ کہیں سفید اور زیادہ سرخ، لباس اعلیٰ، کام میں حد سے سوا تیز، زیور معمولی مگر خاصا۔

ترکی بیوی:

یہ مسلمان ہونے کے لحاظ سے روسی بیویوں سے مختلف ہوتی ہے ورنہ عام حالات میں وہ روسی بیوی سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہے۔ اس کی زیادہ تعداد یورپ میں ہوتی ہے اور کم ایشیا کوچک میں کیونکہ ترکوں کی حکومت ایشیا کوچک سے لے کر یورپ میں تھریس تک چلی گئی ہے۔ یورپین ہونے کے لحاظ سے اس کے اندر وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو یورپ کی ترقی یافتہ عورتوں میں موجود ہیں۔ البتہ یورپ والوں سے مسلسل اور ناقابلِ برداشت لڑائیوں کے باعث اس کی قوم کی اندرونی حالت ہمیشہ سے ابتر رہی ہے، اس لیے یہ اکثر حالات میں مفلس گھرانے میں پیدا ہوتی ہے، پھر ہوش سنبھالتے ہی وہ اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لیے وقف کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ زیادہ تعداد تعلیم یافتہ اور ہنرمند ہے، اس لیے خیالات میں حد سے سوا بلندی اور صفائی ہوتی ہے۔

عام اسلامی رسوم کے ساتھ بیاہ کر شوہر کے گھر آئی اور اس کا پہلا فرض شوہر سے حد سے سوا محبت کرنا ہوتا ہے۔ تعلیم یافتہ ہونے اور تعلیم یافتہ جماعت میں رہنے کے باعث وہ امورِ خانہ داری میں حد سے سوا مستعد اور ہوشیار ہوتی ہے البتہ یورپ کی عورتوں کی طرح وہ شوہر سے برابری کا دعویٰ اس لیے نہیں کرتی کہ اس کی اسلامی یا مذہبی تعلیم اس کے مخالف ہے اور صدیوں سے اس کے ہاں اسلامی آداب و رسوم کے اثرات ورثہ میں چلے آ رہے ہیں اور ایک کافی عرصہ تک وہ ''پردہ'' میں رہی ہے۔

البتہ پچھلی ثلث صدی میں وہ ضرور آگے بڑھی ہے، خصوصاً یورپ والوں کے مسلسل حملوں

نے اسے خواہ مخواہ میدان میں نکل کر کام کرنے کے تجربات ہوئے ہیں۔ اسی ایک چیز نے اسے ان تمام چیزوں کے اختیار کر لینے پر مجبور کر دیا جو یورپ کی عورتیں اختیار کیے ہوئے ہیں۔ پھر بھی وہ بے ضرورت اپنے گھر اور شوہر سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی۔ وہ صدیوں سے حکمراں اور فاتح ماں باپ کی گود میں پلی ہے اس لیے مزاج میں حد سے سوا شرافت، مہربانی، حلم وفیاضی، محبت اور وفاداری کے جذبات بیدار ہیں۔ اسی لیے وہ بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر اور بچوں کے لیے حد سے سوا مفید ثابت ہوتی ہے۔ جنگی قوم کے رکن ہونے کے لحاظ سے اُس میں صبر وقناعت اور محنت و جفاکشی کے حوصلے بیدار ہیں۔ ان پر اسلامی تعلیمات اور آداب نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے اس۔ لیے وہ شوہر کی صحیح معنی کی ''رفیقِ زندگی'' اور ''اولاد کے حق میں'' ''سایۂ عاطفت'' ہوتی ہے۔

اولوالعزمی، بہادری، دلیری اور غیرت وخودداری میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتی۔ شوہر کی ہر مصیبت میں برابر کی شریک۔ اسی لیے وہ قومی جنگ کے ہر دور میں میدانِ جنگ میں جس شجاعت سے لڑی ہے، دنیا کی بہت کم عورتیں اس شدت سے لڑی ہوں گی۔ کیونکہ اس کے ہر مقابلہ میں اسے پُر جوش بنانے والے قومی جذبہ کے ساتھ ساتھ مذہبی جذبہ بھی مشتعل کرتا رہا ہے اور مسلمانوں کے سوا کسی دوسری قوم میں یہ بات نہیں کہ اُس کے ہاں غیر قومی دشمن سے ہر حال میں لڑنا ''تجارت بخش'' اور ''خدا کی رضامندی'' مانا گیا ہو۔ چنانچہ از 1921 تا 1925 اس نے اپنے مردوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں جس بے جگری اور بہادری سے یونانی فوجوں کا مقابلہ کر کے انھیں شکست دی ہے اس نے تمام قوموں میں اُس کی عزت وسر بلندی کو منوالیا ہے۔ وہ بچوں کی اعلیٰ تربیت میں نہایت سر بلند اور بلند مرتبہ قوم مانی گئی ہے اور آج تک کسی دوسری قوم کی غلام نہ بن سکی۔ البتہ 1923 کے بعد سے انھیں مردوں کے برابر حقوق طلب کرنے کا جذبہ اس لیے نمایاں ہوا ہے کہ اب اسے اندرونی حالات کے درستی کا موقع ملا ہے ورنہ یہ جذبہ اس کے لیے نیا نہیں۔ اُدھر اس کا نظام حکومت بھی قائم اسلامی نظام نہیں رہا بلکہ موجودہ حکومت نے ایسی تمام کمزوریوں کو دور کر دیا ہے جو اسلام کے فرضی نام سے اس کی زندگی کو تلخ بنائے ہوئے تھیں اور اسی لیے اب ترکی بیوی اپنے شوہر کے برابر ملازمت، تجارت، صنعت وحرفت کے محکموں اور اداروں میں روزی کماتی نظر آتی ہے۔ پھر بھی وہ اپنے گھر، اپنے شوہر اور رضا کارانہ خدمات پر زیادہ حریص ہے۔ یہ شرف اسی بیوی کو حاصل ہوا ہے کہ وہ موجودہ

قوموں کی بیوی کے ساتھ اپنے شوہر کے برابر عہدہ کی مالک رہی۔ اس طرح کہ ڈاکٹر عذمان بے جب وزیر داخلہ تھے تو ان کی بیوی خالدہ ادیب خانم وزیرِ تعلیمات تھیں۔ پھر بھی اس کی عام زندگی افلاس کے ہاتھوں نہایت افسردہ زندگی ہے اور یورپ میں رہنے اور یورپ کی فارغ البال اور دولت مند قوموں سے میل جول کے باعث اب وہ بھی ان چیزوں کی طالب بن رہی ہے جو یورپ کی عورتوں کو حاصل ہو چکی ہیں اس لیے اندیشہ ہے کہ وہ چند سال کے بعد کہیں اپنے شوہر کے لیے ویسی ہی مصیبت نہ بن جائے جیسی کہ بیا پنے مُلّا رموزی صاحب کی بیوی صاحبہ۔

فی الجملہ وہ شوہر کی حد سے سوا اطاعت کرنے والی، منتظم، کفایت شعار، غیور، خود دار اور وفادار ہوتی ہے چاہے وہ گاؤں کی رہنے والی ہو یا شہر کی۔ قد و قامت نہایت درجہ لائقِ تعریف، بے حد حسین اور نفیس لباس کی شائق مگر زیور کم، جاہلانہ رسوم سے کافی حد تک دور اور مذہب کی لفظ بہ لفظ تابع۔

جاپانی بیوی:

جاپانی قوم جزیروں میں آباد ہے جن کی عام آب و ہوا صحت کے لیے معتدل ہے۔ یورپ والوں سے زیادہ میل جول اور دریائی رشتہ کے باعث اس کے باشندوں کی عام حالت ایشیا کے تمام باشندوں سے بہتر اور نمبر اول ہے۔ خصوصاً ان کی تجارتی زندگی نہایت شاندار اور کامیاب ہے۔ اسی طرح صنعتی انقلاب نے جاپان کو ایشیا کے تمام ممالک سے آگے بڑھا دیا ہے۔

الغرض اس کی بیوی کے عام حالات یہ ہیں کہ یہاں کی عورتیں وہاں کے کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔ لکڑیاں کاٹتی ہیں۔ اچھی خاصی بوجھل گاڑیاں کھینچ کر ایک سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں اور اس کے علاوہ اکثر ایسے کام کرتی نظر آتی ہیں جنھیں سرانجام دینے کے لیے عموماً مردانہ عقل اور قوت کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے مردوں کی طرح پاجامے پہن رکھے ہیں تا کہ کسی قسم کی رکاوٹ کے بغیر چستی اور پھرتی سے کام کر سکیں۔ یہ پاجامے اس قسم کے ہوتے ہیں کہ انگلستان کے کھیتوں میں کام کرنے والی لڑکیاں بھی انھیں بالکل نئے زمانہ کی اُپج خیال کرتیں۔ تجارتی کاروبار میں اکثر عورتیں کمیشن ایجنٹوں کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ اگر کوئی کاروباری آدمی کسی جاپانی ہم پیشہ کے ہاں جا کر

محاصل اور انکم ٹیکس وغیرہ کے متعلق سوال کرے تو اسے یہ جواب سن کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ میں اپنی بیوی سے پوچھتا ہوں اسے ان معاملات کے متعلق مکمل واقفیت حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شمالی جاپان میں مشہور و معروف لکھے پڑھے آدمی بھی اپنی عورتوں سے اس قدر مرعوب ہیں جس قدر آکسفورڈ کے بڑے بڑے پروفیسر یا امریکہ کے کروڑ پتی۔

خاوند کے اخراجات کی فہرست بھی گھر والی ہی تیار کرتی ہے۔ یہی شخص جب صبح کو گھر سے کام پر جانے لگتا ہے تو گھر والی اسے دروازہ تک پہنچانے جاتی ہے۔ اسے اوورکوٹ پہناتی ہے، سگریٹ، دیا سلائی لا کے دیتی ہے پھر بڑے ادب سے جھک کر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتی ہے اور جب تک شوہر دروازے سے باہر نہ نکل جائے یونہی بیٹھی رہتی ہے۔

جاپان میں اولیت کا حق خاوند کو حاصل ہے۔ کمرے میں داخل ہوتے یا وہاں سے نکلتے وقت آگے آگے خاوند ہوتا ہے۔ اسی طرح بازار میں چلتے وقت خاوند دو ایک قدم آگے رہتا ہے اور بیوی چپ چاپ اور عموماً صبر و شکر سے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔

اسی طرح چند اور باتوں سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ جاپان میں میاں بیوی کی مساوات کا خیال ایک خاص مقام پر پہنچ کر رک جاتا ہے۔ عام جاپانی گھرانوں میں مردوں کو کھانا کھلانے کی خدمت عورتیں ہی بجالاتی ہیں اور میاں کو کھانا پیش کرتے وقت گھر والی گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتی ہے۔ مزید براں ان گھرانوں کے سوا جن میں موجودہ گھرانے کے اثرات نے پورا دخل حاصل کر لیا ہو مردوں اور عورتوں کے تفریحی اشغال بالکل الگ تھلگ ہوتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تمام کنبے کے لیے تفریح و تفنن کا پروگرام گھر کا سردار مرد ہی تیار کرتا ہے۔ قانونی نقطۂ نظر سے بھی عورت کی حیثیت مرد سے کمتر ہے۔ اسی طرح شادی بھی عورت کی حیثیت میں اضافہ کا موجب نہیں ہوتی بلکہ اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ عورت اپنے خاوند کے کنبے میں نہ صرف خاوند بلکہ اس کے والدین کی اطاعت و فرماں برداری کے لیے شامل ہو رہی ہے۔ چند سال ادھر تک عورت کی تعلیم کا مقصد محض یہ ہوتا تھا کہ وہ فرماں بردار بیوی اور بہو بننے کے قابل ہو جائے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جاپان کی گھریلو زندگی کا مطالعہ اس خیال کو تقویت پہنچاتا ہے کہ جاپانی خواتین کا درجہ مغربی عورتوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ جاپانی عورتیں عموماً گھر کے تمام معاملات کا خود انصرام کرتی ہیں

اور اکثر ایسی باتوں میں تمام ذمہ داری اپنے اوپر لینے کے لیے تیار رہتی ہیں جن میں مغربی عورتیں ننھے بچوں کی طرح مردوں کے پختہ تر عقل پر بھروسہ کرنے کی عادی ہیں۔ پھر یہی نہیں بلکہ ان کے دلکش اطوار اور خدمت گزاری کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہنے سے انھیں اپنے خاوند بچوں اور اجنبیوں کی نظر میں ایک ایسی اہمیت اور وقعت حاصل ہو جاتی ہے جو انھیں کا حصہ ہے۔

عورتوں کی عقل ناقص ہو یا کامل، لیکن اس امر سے انکار نہیں ہوسکتا کہ جاپان میں اس ''نسوانی فراست'' کے رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑے رہنے سے عورتوں کو نقصان کی بجائے فائدہ ہی پہنچا ہے اور نسوانی زندگی ان بندھنوں کے باعث ویسی ہی دلکش بن گئی ہے جس طرح نثر کے جملے اور الفاظ منظوم ہو کر بن جایا کرتے ہیں۔ تاہم مغربی خیالات اور خصوصاً ان خیالات کا جو اثر تعلیم پر ہوا ہے اس سے جاپانی عورتوں کی مجلسی حیثیت میں بہت کچھ تغیر و تبدل رونما ہو گیا ہے۔ اب جاپانی لڑکیاں اسکولوں میں جاتی ہیں۔ ان کا لباس اور نصابِ تعلیم قریباً ویسا ہی ہے جیسا کہ مغربی طالبات کا۔ وہ علوم فنون میں بھی مہارت حاصل کر رہی ہیں۔ مزید برآں اب جاپانی عورتیں گھر کی چار دیواری سے نکل کر مردوں کے دوش بدوش کام کرنے لگی ہیں۔

ایشیا میں روس، ترکی اور جاپان ہی ایسے ممالک ہیں جن کی نہ فقط تاریخی سر بلندی مسلّم ہے بلکہ موجودہ زمانے میں بھی جن حالات واعمال وآثار واثرات کو ترقی کہا جاتا ہے ان کے لحاظ سے انھیں ممالک نے ایک حد تک یورپ کی ترقی کا مقابلہ کیا ہے اور اسی لیے ان ممالک کی عام عورتوں اور بیویوں کا تذکرہ کیا گیا۔

ان کے بعد چین، بخارا، افغانستان، ایران اور عرب کے متعلق جو کچھ نہیں لکھتے سو اس کا سبب یہ ہے کہ ان ممالک کی گو قدیم تاریخ اور ان کی عورتوں کی روایات نہایت درجہ تابناک ہیں مگر موجودہ زمانے کے لحاظ سے ان کے حالات کافی حد تک تاریکی میں ہیں اور اگرچہ موجودہ زمانے کی تمام تحریکات سے ان ممالک کی عورتیں متاثر ہو رہی ہیں مگر بہ لحاظ اختیار اور عمل یہاں بھی بہت پیچھے ہیں اور چونکہ ہم نے اس کتاب میں اسی ایک بات کا اہتمام کیا ہے کہ ہم 1914 کے پہلے کے حالات سے بحث نہیں کریں گے لہٰذا ان چند سالوں میں عرب کی بیوی، افغانستان کی بیوی، بخارا کی بیوی اور ایران کی بیوی نے جو ترقی کی ہے وہ بہ منزلہ صفر کے ہے اس لیے اس کی تفصیلات ضروری نہیں۔

پھر بھی اتنا بتاتے ہیں کہ ان میں عملی اور ذہنی اعتبار سے "عرب کی بیوی" آج بھی سب سے آگے ہے۔ اگر چہ اس کی تمام تر تربیت خالص اسلامی اصول اور روایات قدیمہ پر ہوئی ہے مگر موجودہ زمانے نے اسے بھی کام کے لیے تیار کر دیا ہے اور گو اس کے ملکی اور مذہبی حالات و آداب اسے شاید دیر تک یورپ کی بیوی کا نمونہ بننے دیں پھر بھی اس نے جدید تعلیم و تربیت کی طرف قدم بڑھایا ہے اور بغداد میں "تعلیمِ نسواں" کے لیے خاص جوش پایا جاتا ہے۔

کچھ شک نہیں کہ عرب کی عورت نے مسلمانانِ ہند کی عورتوں کو ہمیشہ اپنی طرف متوجہ رکھا ہے لیکن عہدِ حاضر میں عربی عورتوں نے کوئی خاص کام نہیں کیا۔ اِلّا یہ کہ جو عربی خواتین موجودہ زمانے کی تحریکات سے فائدہ بھی اٹھانا چاہتی ہیں وہ اپنے شوہروں کے اعتقادی اثر سے مجبور ہیں پھر بھی عرب کی بیوی شوہر کے حق میں اس لیے مفید ہے کہ اس کا آخری مرکز خیال و مرکز امید صرف شوہر ہوتا ہے اور اس کی تمام قربانیاں شوہر کے لیے وقف ہوتی ہیں، اسی لیے اکثر حالات میں اس نے میدانِ جنگ میں مردوں کے ساتھ بھی خوں ریز کاموں میں شرکت کی ہے۔ وہ نہایت بلند اور پاکیزہ خیالات کی بیوی ہوتی ہے۔ حد سے سوا خلیق، مہربان، حلیم، صابر و شاکر، جفاکش، اولوالعزم اور وفادار مگر افلاس اور بے ہنری کے باعث پریشان رہنے والی ہوتی ہے۔ کم علم، کفایت شعار، محنتی اور اولاد سے حد سے سوا محبت کرنے والی کہیں کالی اور اکثر گوری، بے حد صاف ستھری اور پرہیز گار جاہلانہ رسوم سے کافی حد تک پاک اور مذہب سے حد سے سوا مطیع۔

افغان بیوی تقریباً تمام بیویوں سے بہ لحاظ ترقی پیچھے ہے مگر اس کا یہ جوہر اسے عزت کی بلند تر بام پر پہنچاتا ہے کہ وہ بے حد غیور، خوددار اور شوہر کی پرستش کرنے والی ہوتی ہے اور اس درجہ پرستار اور محبت کرنے والی کہ میدانِ جنگ میں وہ ہمیشہ شوہر کے دوش بدوش رہتی ہے۔ البتہ اس کی گھریلو زندگی نہایت تاریک اور قابلِ رحم ہے۔ اس پر "مذہبی اشخاص" کا خاصا دباؤ ہے اور مذہب کے مقابل دنیا میں کسی دوسری چیز کو طاقت اور قابلِ احترام نہیں سمجھتی۔ اس کے شوہر کے ذہنی اور فکری فضا حد سے سوا سست ہونے کے باعث وہ تمام ترقیوں سے محروم اور کوری ہوتی ہے پھر بھی اس کی اولوالعزمی اور جفا پیشگی ہندستان کی عورت ذاتوں کو کافی متاثر کرتی ہے۔

بادشاہ امان اللہ خاں نے 1924 میں چند لڑکیوں کو ڈاکٹری اور طبابت کی تعلیم کے لیے

ترکی بھیج دیا تھا، جس پر افغانستان کے پرانے کارخانوں میں بنے ہوئے مولویوں نے شدید اعتراضات کیے تھے اور امان اللہ خاں کے اس کام کو دینی دیانت اور قومی وقار کے خلاف ٹھہرایا تھا۔

خاصی توانا تندرست، رنگ میں سرخ و سفید، بہادر، مجاہد اور صابر، سادے سے سادہ لباس کی عادی، شوہر کے حق میں وفا پیشہ اور اولاد کے لیے "مادر مہربان" معمولی سی غذا، معمولی سامکان اور معمولی سے لباس میں خوش رہنے والی مولویانہ صوفیانہ اور جاہلانہ رسوم میں گرفتار مگر شوہر کے حق میں سراپا رحمت اسلامی اصول کی معتقد اور اسلامی تہذیب قدیم کا نمونہ۔

چینی بیوی کے حالات بہت زیادہ تاریک ہونے پر بھی موجودہ زمانے میں وہ نئی ترقی کی کوششوں میں خاصا حصہ لے رہی ہے۔ اب وہ بھی اسکول، کلب، تھیٹر اور میدان جنگ کے اندر جاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مگر حد سے سوا سست رفتار البتہ اس کی جن چیزوں نے ہندستانی عورتوں کو متاثر کیا ہے وہ اس کی حد سے سوا اولوالعزمی اور بہادری ہے۔ وہ اس درجہ جفاکش ہوتی ہے کہ شوہر کے طریقے اور اخلاقی حالت خالص قدیم ہے اور اسی لیے وہ ہندستان میں آج بھی پچھلی اور تاریک رسوم واصول زندگی کے ساتھ نظر آتی ہے۔ وہ تجارتی ذوق کی بیوی ہوتی ہے اس لیے شوہر سے ہمیشہ مستغنی رہتی ہے یہ نہیں کہ بس ملا رموزی صاحب ہی کے بھروسہ پر بیٹھی ہوئی ہیں۔ بھلا یہ حوصلہ کیا کم ہے کہ تین تین انچ کے پاؤں سے وہ چین سے ہندستان اور دور دراز مقامات کا سفر کرتی ہے مگر گھبراتی نہیں۔ لباس اور عام معاشرت کے حساب سے وہ بڑی جفاکش اور دولت جمع کرنے والی ہوتی ہے۔ شوہر کی فرماں بردار مگر افیون کھالینے کے بعد بیوی کا بھی خدا حافظ اور شوہر کی بھی پولیس محافظ۔

یہ ہندستان میں جب اپنے گھروں میں کاغذ کے کھلونے فروخت کرنے آتی ہے تو اس کے اندر ادنیٰ جھجک نہیں ہوتی مگر اپنے ننھے میاں کی والدائیں اس سے ڈرتی بھی ہیں اور اُسے غور سے دیکھ کر بھی حیران رہ جاتی ہیں اور بھی بیوی اور اس کے "بیویانہ حالات" کی تفصیلات سے پہلے دنیا کی تمام بیویوں کے موجودہ حالات کا ایک دھندلا سا خاکہ آپ کے سامنے آجائے تا کہ آپ سمجھ سکیں کہ دنیا کے تمام انسانوں کی بیویاں زیادہ تعداد میں کس حیثیت اور کن حالات کی بیویاں ہیں اور عورت کی حیثیت کے ساتھ ہی وہ بیوی کی حیثیت سے کیا کچھ کر رہی ہیں؟ اور یہ جو آج دنیا میں عورتوں کی ترقی، عورتوں کی اصلاح عورتوں کے حقوق اور عورتوں کی تعلیم وغیرہ کے متعلق تمام دنیا میں ہنگامے ہو رہے ہیں اس میں ان ممالک کی عورت نے بیوی کی حیثیت سے کون سے اور کتنے تیر مارے ہیں تا کہ اگر

ان سب کے تیروں ہی کو انسانی خطرات کے دفع کرنے کا ضامن قرار دے دیا جائے تو پھر اس اپنے ہندستان کی بیوی کو بھی وہی تیر مارنا چاہیے۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اچھا اگر دنیا کی دوسری عورتیں بیوی کی حیثیت سے آئندہ زندگی اور ترقی کا یہی وطیرہ اختیار کریں گی جو اوپر بیان ہوا تو پھر لائیے اور بتائیے کہ ہندستانی بیوی ان حالات کے لحاظ سے آج کل کن حالات میں مبتلا ہے اور کیا کر رہی ہے؟ تا کہ آسانی سے فیصلہ کیا جاسکے کہ اب ہمیں اپنی اپنی بیویوں کو طلاق دے دینا چاہیے یا انھیں دنیا کی مذکورہ بالا قسم کی بیویاں بنانا چاہیے یا موجودہ حالت ہی میں چھوڑ دینا چاہیے یا خود اپنے ملک اور اپنے حالات کے موافق انھیں آگے بڑھانا چاہیے۔ پس ان تمام حالات کے سمجھنے کے لیے آپ کو ہندستان کی آنے والی بیویوں کے حالات کو ملاحظہ فرمانا ہوگا اس لیے معلوم کیجیے کہ ہندستان ایشیا کا وہ عظیم الشان حصۂ آبادی ہے جس کے اوپر یا جس کے اندر ایک نہ دو پورے 35 کروڑ انسان آباد ہیں اور مردم شماری کے فیض سے ہر دس سال کے بعد کچھ نہ کچھ بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ اب یہ کل ہندستان یا یہ کل 35 کروڑ باشندے کوئی دو سو برس سے انگریز نام کی ایک قوم کے ماتحت ہیں جو یورپ کے ملک انگلستان میں آباد ہے۔ ہندستان کی سب سے زیادہ تعداد والی قوموں میں پہلے ہندو پھر مسلمان پھر سکھ اور ایرے غیرے نتھو خیرے مانے جاتے ہیں۔

ہندستان کا زیادہ حصہ گرم ہے اور آب وہوا زیادہ مقدار میں غیر معتدل، اس لیے یا اور کسی سبب سے یہاں کے باشندوں میں افلاس، تنگدستی، بے ہنری، جہالت، طاعون، انفلوئنزا، تپ دق، نمونیا، ہیضہ، کالی کھانسی، ملیریا، دردگردہ، دردقولنج، دردسر، درددرتج، پسلی کا درد، مالیخولیا، مراق، جنون، ہول، وحشت، قبض دائمی، کھٹی ڈکار آنا، سوء ہضمی، سینہ جلنا، طحال، اسہال، پیچش، بواسیر ریحی، بواسیر خونی، نفخ، گٹھیا، فساد خون، فالج، اختلاج قلب، ذیابطیس، سل، تپ کہنہ، جذام، غشی، مرگی، دمہ، استغراق، پت، امتلا، سدّہ، پتھری، جلندھر، چیچک، ضیق النفس، خناق، خنازیر، ذات الجنب، رسولی، ذات الصدر، یرقان، سلسل بول، پھوڑا، دنبل، لقوہ، وجع مفاصل، نقرس، رعشہ، سکتہ، عرق النساء، استسقا، گنج، خارش، آشوب چشم، ضعف بصارت، جالا، غبار، سرخی، پانی بہنا، سرطان، نزول الماء اور خدا جانے کتنے امراض ہر وقت پائے جاتے ہیں، پھر ان پر کتے کا کاٹا ہوا، سانپ کا کاٹا ہوا، بچھو کا کاٹا ہوا، مسلمان کا کاٹا ہوا، ہندو کا کاٹا ہوا، افسر کا کاٹا ہوا، خفیہ پولیس کا کاٹا ہوا، تھانیدار کا کاٹا ہوا، حلقے کے

داروغہ کا کاٹا ہوا، فرض اور برطرفی کا کاٹا ہوا اور جو یہ کچھ بھی نہیں تو بیوی بچوں کا کاٹا ہوا اور ان سب کے بعد افیون، گانجا، چرس، بھنگ، حقہ، بیڑی، سگریٹ، شراب اور قمار بازی کا کاٹا ہوا، مریض بھی یہاں بکثرت موجود ہے۔ ورنہ صبح وشام اور کھانسی وزکام اور اگر بالکل ہی نہیں تو اعضا شکنی اور جمائیوں سے تو یہاں کے رئیس امیر اور عہدہ دار بھی محفوظ نہیں، غرض ہندستانی عورت اور مرد کے بھی وہ موانع اور حالات ہیں جن کے باعث وہ آج کل کی سی ترقی سے محروم ہے۔

البتہ اس کی بیداری اور غفلت سے چونکا دینے والی حرکت اصل میں انگریز قوم کا غلبہ ہے، جس کے باعث وہ ان کے تمدن، ان کی تہذیب، ان کی ایجادات، ان کی سیاست، ان کی تعلیم، اور ان کے عام طریقوں سے ایک عرصہ سے دوچار ہو رہی ہے، مگر ہندستانی مردوں کی حد سے گزری ہوئی جہالت، قناعت پسندی اور تاریک ترین اعتقادی ذہنیت نے کبھی اپنی عورتوں کو آگے بڑھانے پر آمادہ نہیں کیا اور اس کے قوی ترین اسباب میں سے ایک تو ان کا یہ عقیدہ ہے کہ عورت ''صرف مرد کی خدمت گزاری'' اور ''اطاعت'' کے لیے پیدا ہوئی ہے اور مذہباً وہ مرد سے کسی حیثیت سے بھی آگے نہیں بڑھ سکتی، دوسرے خود یہاں کے مردوں کی بے ہنر اور بے علم زندگی نے انھیں کبھی فراغت سے اتنا بھی دوچار نہیں ہونے دیا کہ وہ اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت میں وقت اور دولت سے کام لیتے۔

ان معنی میں گزشتہ سلاطین ہند اور اس کے بعد سے اس وقت تک کے شعرا نے بھی ہندستانی عورت کو مرد سے پیچھے رکھنے میں خاصا کام کیا اور اپنی تمام شعری قوتیں اسی ایک خیال اور عقیدے کو طاقت بنانے پر صرف کرتے رہے کہ عورت صرف محبت کرنے اور گھر کی رونق کے لیے پیدا کی گئی ہے اور وہ ایک ایسی ہی نازک سی چیز ہے جو ادنیٰ سی محبت کرنے سے تھک کر بیکار ہو جائے گی۔ پس ان خیالات اور حالات کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ ہندستانی عورت گھر کی چار دیواری کے اندر تباہ ہو جائے، مگر انگلستان سے آنے والے مردوں اور عورتوں نے کوشش کی کہ ہندستانی عورت بھی مرد کے برابر کام کرے اور مرد کی تمام ذمہ داریوں میں برابر کی شریک نظر آئے۔ یہ ایک ایسی کوشش تھی جس کی رفتار بہت کم اور سست تھی اور اسی لیے ہندستانی عورت کو مرد کے برابر کام کا بنانے کے لیے کافی عرصہ گزر گیا۔

لیکن پچھلی نصف صدی میں جب ہندستانی مرد انگریزوں کی زندگی سے تعلیم کے باعث

ایک حد تک واقف ہوئے تو ان کے سامنے انگریز عورتوں کی زندگی آئی اور وہ نہایت دھیمی رفتار سے اپنی عورتوں کی اصلاح کی طرف بڑھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب یہ مسئلہ دماغ اور خیال سے بڑھ کر عمل میں نظر آنے لگا اور ہندستانیوں کی یہ ''گھریلو زینت'' اب اسکول میں نظر آنے لگی، مگر عجیب وغریب مشکلات کے ساتھ مثلاً پہلی مرتبہ جب یہ بغرض تعلیم اسکول میں آئی ہے تو مذہبی معتقدات نے اسے سختی سے روکا اور جگہ جگہ سے اس کے خلاف مذہبی آوازیں پیدا ہونے لگیں، اس کے بعد اس کی مالی مشکلات نے اسے روکا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اسکول پہنچ کر بھی ناکام واپس لوٹنے پر مجبور ہوگئی۔

مسلمان عورت کے بڑھنے میں اگر مذہبی رنگ کی قیود سخت تھیں تو ہندو عورت کے لیے ہندستان کا یہ خیال زبردست مانع تھا کہ عورت مذہباً اس قدر مقدس چیز ہے کہ بس اسے گھر میں بٹھا کر پوجا جائے۔

غرض دونوں قوموں کے خیالات یہی رہے کہ عورت ہر حال میں نازک، نفیس، پاکیزہ تر اور کچھ بڑی ہی لوچ دار چیز ہے جو تعلیم وتمدن اور ترقی میں مردوں کی طرح محنت برداشت نہیں کرسکتی بلکہ بے عمل اور سست فطرت شعرا کے لیے ایک طرح کا مصرع طرح ہے جس پر بس خیالی اور طرحی طبع آزمائی تو کی جاسکتی ہے مگر اس کو کام پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، لیکن طبعی ارتقا کے قدرتی اثر نے اور انگلستان کی عورتوں کو بھی کام کے لیے پرجوش بنایا پھر بھی کافی سست رفتاری کے ساتھ مگر 1914 کی جنگ یورپ نے جب ہندستان کے سترہ لاکھ مردوں کو میدان قتل وقتال میں کھینچ لیا اور زندگی کی ہر چیز میں حرکت اور تبدیلی پیدا ہوگئی تو ہندستانی عورت کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس جنگ کے بعد جنگ روس یا انقلاب روس اور جنگ ترکی ویونان بابت 1917 ، 1921 میں جب روسی اور ترکی عورتوں نے میدان جنگ میں مردوں کے برابر خدمات انجام دیں، اِدھر اطلاعات اور اخبارات کے ذرائع عام ہوگئے تو ہندستانی عورت یکا یک گھر سے باہر نکل آئی اور اس قدر جوش کے ساتھ بڑھی کہ اب اس کا پیچھے دھکیل دینا کسی کے بس کی بات نہ رہی اور اب وہ بازار، اسکول، شفاخانے، وکالت، ہائی کورٹ، اخبار نویسی، لیڈری، تجارت اور تھیٹر اور سنیما تک میں نظر آنے لگی۔ جب یہ ہوا تو پھر کیا تھا مردوں نے بھی سوچا کہ عورت ذات کو اپنا احسان جتانے کا بھی موقع ہے اس لیے انھوں نے بھی عورت کو ترقی دینے کا وعظ شروع کردیا۔

اب ایک نازک سوال یہ ہے کہ آیا ہندستانی عورت کی ''موجودہ کارگزاری'' یورپ کی اقوام سے متعلق ہونے کا نتیجہ ہے یا اس کا طبعی انقلاب ہے؟ پھر یہ کہ وہ جس رنگ میں آگے بڑھی ہے وہ اس کا قدرتی رنگ ہے یا غیروں کا؟ پہلے دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں ہے یعنی ہندستانی عورت واقعی سب سے پہلے انگریزی عورت سے متاثر ہوئی ہے پھر اس کے ذہنی قویٰ عرصہ کے جمود کے بعد اب قدرتاً بیدار ہوئے ہیں اور اس میں ترقی اور تبدیلی کا احساس اس کے طبعی ارتقا کا اثر ہے جو درختوں میں بھی ہوتا ہے اور ہر نشوونما پانے والی چیز میں البتہ آخر کا مسئلہ مشکوک ہے مثلاً یہ کہ ہندستانی عورت کے لیے موجودہ رنگ کی ترقی اس کی اصلی و طبعی ترقی و تبدیلی ہے یا نقلی؟ سو اکثر حالات کے لحاظ سے اس کی موجودہ تبدیلی نقلی ہے اور بعض حالات میں طبعی اور ذاتی جس کے زیادہ صاف معنی یہ ہیں کہ ہندستانی عورت کے لیے انگریزی عورتوں کی نقل نہ مفید ہے نہ پائیدار۔ اسی طرح اس کی ملکی اور طبعی تبدیلی دنیا کی عام زندگی کے مقابل کبھی مفید اور سودمند نہیں ہو سکتی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک صدی کے اندر ہندستانی عورت یورپی اور ہندستانی اثرات سے مل جل کر ایک بالکل ہی ''جدید زندگی کی مالک ہو جائے گی'' اور کچھ شک نہیں کہ اب ہندستانی عورت اپنے پچھلے حالات کی طرح کبھی واپس نہ جائے گی۔ پس جب یہ خیال نہایت صحیح ہے کہ اب ہندستانی عورت آگے بڑھے گی اور بڑھ کر رہے گی اور بڑھتی ہی چلی جائے گی اور بڑھتی ہی رہے گی اور جب بڑھی تو پھر بڑھی ہی بڑھی تو پھر ضرورت ہے کہ ہم بھی یہ کہہ کر کھڑے ہو جائیں اور اس کی مدد کریں کہ آ بھی بڑھ اگر تو بڑھتی ہے تو ہم بھی تیری امداد کو موجود ہیں۔ لہٰذا جب ہم یہ کہنے کے لیے مجبور ہیں تو پھر اصولاً ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ آج کل کن حالات و اثرات میں ہے۔ خصوصاً اس حیثیت سے کہ وہ بیوی ہو کر اپنے مردوں کے لیے آج کل کیا کر رہی ہے اس لیے ذیل کی بیویاں ملاحظہ ہوں تا کہ آئندہ انھیں آگے بڑھانے اور اپنے حق میں مفید بنانے اور خود ان کے لیے مفید بننے میں آسانی ہو۔

واضح ہو کہ آئندہ آنے والی بیویوں میں اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہندوستان کے ایسے فرقوں اور طبقوں کی بیویاں لی جائیں جو مل جل کر ہندستانیوں کی اجتماعی اور قومی زندگی کی سب سے زیادہ ذمہ دار بھی ہیں، مگر سب سے زیادہ پست، پستی کے یہ معنی نہیں کہ ذات پات کے لحاظ سے پست بلکہ پستی کے معنی یہاں ان کی اور ان کے مردوں کی یکسر جہالت ہے۔ چنانچہ آنے

والا باب صرف ایسی ہی بیویوں سے متعلق ہے جن کے تقریباً پورے خاندان کو بھی علم چھو کر نہیں گزرا ہے درآنحالیکہ یہی تمام جاہل مرد اور عورتیں مل کر ہندستانی آبادی کا غالب ترین حصہ ہیں۔ کیونکہ صرف ملّا رموزی صاحب اور ان کی مبلغ ایک بیوی تو ہندستان کی کل آبادی نہیں ہو سکتی ہیں اس لیے ملاحظہ فرمائیے کہ ہندستان کی غالب آبادی کس حال میں ہے؟۔

نئی اور پرانی شاعری

اربابِ علم جانتے ہیں کہ انسانی دماغوں کے تاثر و انقلاب اور ذہنی تغیر کے لیے علاوہ ظاہری اسباب و تحریکات کے ایک غیر محسوس مگر اندرونی تحریک بھی ہوا کرتی ہے، جو اجتماعی اور ذہنی حالت کو بدلتی رہتی ہے۔ اسی تحریک کو "ارتقائے طبعی" بھی کہتے ہیں۔ یہی وہ قوت ہے جو ہمارے آداب و رسوم اور تہذیب و خصائل کو زمانے کے موافق بدلتی رہتی ہے اور تمام اشرف المخلوقات اسی رنگ میں رنگ جاتے ہیں، جو زمانہ بدلتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو آج انگرکھا، عمامہ، کرتا، پاجامہ اور دیسی جوتا پہننے والے قدیم لٹھ بند بنی نوع بشر کو جو کوٹ، پتلون، ٹائی، کالر اور موزے پہنے پھر رہی ہے، مگر نہیں شرماتی پھر یہ اس لیے نہیں کہ نیچریوں نے "مشاہیر پرستی" چھوڑ کر اپنے بزرگوں کی وضع قطع سے "ترک موالات" کی تحریک کی ہے۔ بلکہ ارتقائے طبعی کا لازمہ ہی اس حرکت کا محرک ہے جو اپنے تمام متعلقات کو متاثر کرتا ہے۔ اور اسی لیے آج بغیر کسی "مارشل لا" (فوجی قانون) کے ہم خود "السلام علیکم" کی جگہ "گڈ مارننگ" پسند کر رہے ہیں۔ لیکن کیا کہیے گا اردو زبان کے اُس طائفۂ شریفہ کو جس کی ذہنی حالت 1927 میں بھی قدامت و بے خبری کے اسی نقطۂ ساکنہ و جامدہ پر ڈٹی ہوئی ہے، جہاں سے باوا آدم کی بغیر حجامت بنی ہوئی ابتداءً روانہ ہوئی تھی اور یہ مقدس طبقہ اردو شعرا کا ہے جو اردو کے حامی ہیں۔

آپ عرب و عجم کے جس قصبے میں چاہیں چلے جائیں، یہی نہیں سنیں گے کہ شاعری اور مضمون نگاری قوموں اور جماعتوں کی ذہنی اصلاح و ترقی اور انقلاب و تغیر کا ایک کامگار آلہ ہے۔ بشرطیکہ اس کے لکھنے اور جاننے والے بیدار اور ضرورت آشنا ہوں۔ لیکن ہندستان جہالت نشان میں اردو شاعری کے لیے موجودہ عہد کی قیامت آفریں ترقیاں اور بیداریاں صرف اتنا اثر دکھا سکیں کہ

پنجاب میں ڈاکٹر اقبال اور اَودھ میں حسرت موہانی نے ایک ایک دیوان آب وتاب سے شائع کر کے گھر میں رکھ لیا اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی۔ اب اردو کے دورِ حاضر کے ان دونوں جلیل القدر شاعروں سے نہ کوئی سند لیتا ہے نہ انھیں کسی مشاعرے میں بلایا جاتا ہے۔ البتہ اردو کے حامی اور مصلح آج بھی غالب ومومن اور آزاد وحالی کی نظم ونثر لیے پھر رہے ہیں۔ یقیناً باوا ولی دکنی سے لے کر آزاد وحالی کے احسانات اردو زبان پر کسی اولاد کی طرح اس کے بزرگوں سے بھی زیادہ ہیں جو کسی طرح قابلِ خاموشی نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر یہ قدماپرستی کب تک؟ ہم تو پیچ در پیچ عبارت کے مقابل صاف کہتے ہیں کہ اچھا اگر ہم آج بھی غالب کے رنگ میں غزل کہیں تو پھر ''انجمن حمایت اسلام'' اور ''مسلم لیگ'' کے جلسوں میں نظمیں کہنے والے کب پیدا ہوں گے؟ حالی اور سرسید کے طرز میں اگر کوئی مضمون لکھیں تو خلافت کمیٹی میں ان سے متاثر ہو کر کون چندہ دے گا؟

امرتسر میں تو غالب پرستی کا سنگ بنیاد ہی رکھ دیا گیا اور مرزا شجاع مردی نے رسالہ غالب جاری فرما دیا۔ لیکن کوئی نہیں جو استاد اقبال اور استاد حسرت ایسے عہدِ حاضر کے اساتذہ کے نام سے رسالہ جاری کرے جن کا کلام ہماری موجودہ فضا میں ہر طرح سند کے قابل ہے، لیکن دیکھا جاتا ہے کہ ''انگریزی یافتہ'' عرف تعلیم یافتہ جماعت ہے کہ غالب کی ذہنیت، غالب کی شرح اور متروکاتِ غالب ہی پر تمام زور ختم کر رہی ہے۔ آج جبکہ غالب کے دیکھنے والے بھی نہیں ملتے ان کے کلام پر وہ شرحیں لکھی جا رہی ہیں۔ اشعار میں وہ معنی پہنائے جا رہے ہیں جو واللہ خود غالب مغفور کو نہ سوجھے ہوں گے۔ اور یہ سب اس لیے کہ ہم آج بھی کلام غالب کا اتباع کریں۔ مگر ہمارے نزدیک کسی شاعر یا مصنف کے کلام پر اس کے بعد شرح لکھنا حقیقت میں اس کمی کی تکمیل ہے جو شاعر یا مصنف کی زندگی میں رہ گئی ہو اور جو محض ربط کلام کے قیاس وانداز ہ پر مبنی ہوا کرتی ہے۔ اگر ولی دکنی اور غالب اکبرآبادی کے زمانے میں لوگ اس قدر بیدار ہوتے تو ان کی زندگی ہی میں ان کے کلام کی شرح لکھ کر ان کے دستخط کرا لیتے اور ایسی ہی شرحیں ہو سکتی تھیں جنھیں ہم آج بھی آنکھوں سے لگا لیتے، لیکن کس قدر ظلم ہے کہ اقبال وحسرت آج بھی خیر سے زندہ ہیں، مگر ان کے کلام پر شرح لکھ کر ان کے پاس کوئی نہیں لے جاتا کہ لیجیے حضرت بعد اصلاح تصدیق کا انگوٹھا لگا دیجیے تاکہ آنے والی نسلوں کو اس کی صحت میں کوئی احتمال نہ رہے اور آپ کا کلام قیاسی ٹھونس ٹھانس سے ابداً آباد تک محفوظ رہے۔ ورنہ کون

ہے جو اقبال کے بعد بتلائے گا کہ اقبال ایک شاعر تھے اور اس زمانہ کا ماحول یہ تھا کہ حکومت ترکی کے پاس منصب خلافت تھا اور اس پر یونان، اٹلی، بلغاریہ، سرویہ، رمانیہ وغیرہ اکثر حملہ کرتی رہتی تھی، ترکوں کی شکست سے ہندستان کے مسلمان بے چین رہتے تھے، اس لیے اقبال نے ترکوں کی پے درپے شکست سے متاثر ہو کر ترانہ لکھا، شکوہ لکھا اور جب ترکوں کی حکومت باہمی نااتفاقی کی وجہ سے روز بروز گھٹتی اور کم ہوتی رہی تو ''جواب شکوہ'' لکھ دیا۔

کون بتلائے گا کہ حسرت موہانی ایک سیاسی لیڈر تھے۔ اور جب کانپور میں کھدر کی دکان پر بیٹھے تھے، باغیانہ کوششوں کی وجہ سے انگریزی حکومت کا وارنٹ گرفتاری آیا تو کہنے لگے کہ حوالات چلتا ہوا، مگر ترک موالات کی وجہ سے خود قدم نہ اٹھاؤں گا۔ تم میرے بازو پکڑ کر حوالات لے چلو تو چلوں گا پھر وہ جب جیل میں گئے تو قید بامشقت کی سزا میں ان سے کہا کہ چکی چلاؤ۔ تو وہ گیہوں بھی پیستے تھے اور غزل بھی کہتے جاتے تھے، اس لیے ان کے کوئی گیسو والا معشوق نہیں بلکہ ان کا مخاطب معشوق ملک اور اس کی آزادی تھا۔ لیکن دیکھنا جب حسرت کا وقت مقرر پر انتقال پُر ملال ہو جائے گا تو کوئی سو دو سو برس کے بعد ان کے کلام کی قدر ہوگی اور لوگ ان کے دیوان پر شرح لکھیں گے اور ان کے زمانے کا نقشہ یوں تیار کریں گے۔

> ''حسرت موہانی ایک بڑے صوفی اور رند مشرب بزرگ تھے۔ آخر زمانے میں پادشاہ کی ہجو لکھی تو پادشاہ نے دربار سے علاحدہ کر دیا اور وہ افلاس کی وجہ سے آخر عمر میں محلے والوں کا آٹا پیسا کرتے تھے اور چکی چلا کر پیٹ بھرتے تھے، جیسا کہ خود انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:
>
> ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
> اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی''

اس حیثیت سے میں پنجاب کی اس جدید اردو پسند جماعت کے ساتھ ہوں جو کہتی ہے کہ:

> ''اردو کے عہد ماضی کو چھوڑ دو اور عہد حاضر کے مشاہیر اردو سے استفادہ کرو اور سندیں لو''۔

اور یہ اس لیے کہ اساتذۂ قدیم کے مقابل اساتذۂ حال کا کلام بہ اعتبار فن اور بلحاظ

جذبات ہماری موجودہ فضا کے عین موافق ہے۔ لیکن دہلی اور لکھنؤ کی لڑائیاں اسی طرح جاری ہیں۔ وہ آج بھی داغ، غالب اور امیر دبیر کو زندہ کر رہے ہیں۔ نثر اردو کے حامی ہیں کہ حالی و آزاد اور سرسید کے طرزِ تحریر لیے پھرتے ہیں حالانکہ موجودہ لٹریچر (خواہ شاعری یا نثر) کے لیے یہ چیزیں اب کسی طرح ضروری نہیں ہمارا دور جدید شروع ہونا چاہیے۔ اور نظم میں اقبال وحسرت، عزیز وجوی اور نثر میں ابوالکلام اور ظفر علی خاں، حسن نظامی اور راشد الخیری وغیرہ سے سند کا کام لیا جائے کہ یہی ہمارے اس ترقی پذیر دور کے اساتذہ اور ناخدایانِ ادب ہیں۔ اگر ان میں اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے مدون کردہ اصولِ ادب و اسالیب انشا کو بھی مرکزیت کا درجہ دیا جائے تو نہایت مستحسن ہے کہ دورِ حاضر کی اردو کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی ہی مسلمہ مرکز وسند ہے اور کچھ کچھ ہم بھی اگر مانو ہم کو تم سب۔

شعری انتخاب

یورپ سے آرہی ہیں یہ روشن خیالیاں

چوٹی کے بدلے سر پہ ہیں ریشم کی جالیاں
کالے لبوں پہ خونِ تمنا کی لالیاں
چوٹی کٹا کے ہیٹ ہے لیلیٰ کے سر پہ آج
مجنوں کی دیکھیے تو ذرا انفعالیاں
ہیں اینگلو انڈین سے بھی رتبے میں کمتریں
ان گوریوں میں لاکھ ملیں اپنی کالیاں
مسٹر لنگوٹ بند ہیں پاجامہ پھینک کر
مِس نے اتار پھینکی ہیں کانوں سے بالیاں۔۔
بے پردہ ہو کے آئیں کریمن کی والدہ
مسٹر بجا رہے ہیں کھڑے ہو کے تالیاں

امراض لا رہی ہیں وہ ہندوستان میں
یورپ کی گندگی کی جو آئی ہیں نالیاں
مَردوں کو کوستی ہیں کہ پردے میں کیوں رکھا
مِس صاحبہ کی سُنیے تو آتش مقالیاں
اسلام اور ہند کی تہذیب سے نہیں
یورپ سے آرہی ہیں یہ روشن خیالیاں
تاریک ذوق کہہ کے رموزی کی نظم کو
اردو میں دے رہی ہیں وہ انگلش کی گالیاں

◆

للہ بھاگیے نہیں ہندوستان سے

للہ بھاگیے نہیں ہندستان سے ۔۔۔ مارے بھی جائیں آپ اگر اس میں جان سے
ہندو کا ہند ہے تو مسلم کا بھی یہ ہند ۔۔۔ ڈٹ ڈٹ کے رہیے آپ بھی اب آن بان سے
جغرافیا میں، میں نے پڑھا ہے کہ بھاگنا ۔۔۔ اک لاکھ دور ہے مسلم کی شان سے
بے بس کو اور غریب کو لاٹھی کے زور سے ۔۔۔ وہ مرد ہی نہیں جو نکالے مکان سے
اتنا نہ بھاگتے ہی چلے جایئے کہ آپ ۔۔۔ جاتے رہیں ہمارے بھی وہم و گمان سے
ملاّ رموزیوں نے کہا ڈٹ کے آج شب
مرجائیں گے نہ جائیں گے ہندوستان سے

◆

اے ٹی کیٹ

عشا کے بعد ہوئی میری بیویوں میں ڈبیٹ
میں گیلری ہی میں بیٹھا کہ خود میں آیا تھا لیٹ
ہزار لغزشوں پر بھی اس لیے تھا خوش
کہ بدّھوتسم کے شوہر کا ہے یہ اے ٹی کیٹ

تھیں اُن میں اک جو ریاضی میں ماہر و کامل
سنا رہی تھیں دھڑا دھڑ بلیک والوں کو ریٹ
قرار داد میں بے اختلاف طے یہ ہوا
سمیٹا جائے جو کچھ تجھ سے تو وہ جلد سمیٹ
بلیک ہے کہ وہ جب تک نہ ہو دماغ درست
نہ ہوگا سیر رموزی بلیک والوں کا پیٹ

◆

ماڈرن غزل

فوجِ یورپ کا کوریا میں جماؤ — معنی یہ ہیں کہ ایشیا میں جماؤ
عذرِ قانون و جنگ و سنگ سے اب — جتنا ہو ایشیا میں خود کو بڑھاؤ
بڑھ گئے ہیں جو یورپی انساں — ان کو اب ایشیا میں لا کے بساؤ
کس رہا ہے شکنجۂ یورپ — بے ہنر لوگوں پہ ہے اس کا دباؤ
یورپی ایشیا میں نہ آئے — عقل ہو تو کوئی بریک لگاؤ
میرے ہندوستان کے لوگو! — آسماں توڑ تم بھی بم تو بناؤ

سارے ملا رموزی ہیں غصہ
بیویاں کہتی ہیں کہ روز کماؤ

◆

یہ آگے بڑھ کر پیچھے ہٹ رہے ہیں

نام اصلاح کا جو رٹ رہے ہیں — یہ بڑھتے کیا ہیں اُلٹے گھٹ رہے ہیں
تدبیریں ہیں ناقص اس لیے خود — یہ آگے بڑھ کے پیچھے ہٹ رہے ہیں
سبھا اور انجمن ہی کے نام سے — یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کے بٹ رہے ہیں
اذانِ مسجد و ناقوسِ مندر — ان آوازوں پہ ظالم کٹ رہے ہیں

جو بادل بن کے چھائے جا رہے تھے — میں سنتا ہوں کہ اب وہ پھٹ رہے ہیں
رموزی آج یہ بھرتی کے لیڈر
خدا کا شکر ہے خود چھٹ رہے ہیں

◆

طُرفہ مذاق

اگلی سی اب نہ گھر میں مرے تو، مذاق ہے — معمولی درجہ کا نہ کوئی اب نفاق ہے
یورپ کا جب سے عہدِ مساوات آگیا — اب ہر قدم پہ خلع ہے یا پھر طلاق ہے
بیوی کے زیورات ٹھکانے لگادیے — کلو قمار بازی میں اس درجہ طاق ہے
اب عشق اصلِ صحتِ جسم و دماغ ہے — وہ دن گئے، جو کہتے تھے، عشق اک مراق ہے
اِک مولوی نے آج رموزی سے یہ کہا
یہ نظم یار لوگوں پہ بے حد شاق ہے

◆

حسن و عشق

عشق خوددار و خود آرا چاہیے — قدردانِ حسن یکتا چاہیے !!
ہر جوانی حسن ہوسکتی نہیں — حسن کو بھی اک سلیقہ چاہیے
حسن بے مایہ ہے یعنی اس کو بھی — ایک موزوں تر سراپا چاہیے
عشق کی فکر و نظر رنگین ہو!! — حسن میں تخیل علیا چاہیے
عشق جب ایثار و قربانی کرے — حسن بھی پھر لطف فرما چاہیے
حسن بے پروا سے بے پروا رہو — اس کے جلوہ تک سے پروا چاہیے

◆

حسن و عشق

نہ فلسفہ ہے، نہ منطق ہے اور نہ حکمت ہے
تاثرات کی رغبت کا نام الفت ہے
یہ حسن کیا ہے ، جسے عشق خود پسند کرے
اور عشق کیا ہے، لطافت کی ایک رغبت ہے
یہ ہجر اور جفائے جمال کچھ بھی نہیں
یہ نظم عام کے اک ضابطے کی شدت ہے
اب اس کے بعد بھی محبوب میں اگر ہے جفا
تو وہ جفا تو نہیں ہاں حجاب الفت ہے
یہ ناز و غمزہ و حسن حجاب ہی وہ ہے
کہ جس سے عشق میں پیدا طلب کی فطرت ہے
غرض کہ دونوں میں ذوق موانست ہے کہ یہ
نظام فطرت اجسام کی ضرورت ہے
اب حسن چاہے تو اسباب قرب پیدا کر
کہ قرب ہی میں محبت کی اصل قوت ہے
یہ آہ و نالہ و لفظ کشش تو کچھ بھی نہیں
کہ قرب ہو تو نہ فرقت ہے پھر نہ نفرت ہے

ملا رموزی مشہور و معروف ادیب، طنز و مزاح نگار، کالم نویس، شاعر اور مخصوص طرز نگارش گلابی اردو کے موجد تھے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1917 سے کالم نویس اور مضمون نگار کی حیثیت سے کیا اور تقریباً 35 سال تک مختلف موضوعات پر لکھتے رہے۔ ان کی پچاس سے زیادہ کتابیں شائع ہوئیں۔ ملا رموزی نے قومی و ملی مسائل خصوصاً مسلمانوں کے ملکی اور بین الاقوامی مسائل پر اپنے مخصوص اسلوب میں لکھا اور ان کی ان تحریروں کا ایک عالم گرویدہ ہوگیا۔ انھوں نے سنجیدہ سے سنجیدہ موضوعات پر لکھتے ہوئے بھی طنز و مزاح کی گنجائشیں نکال لیں۔ ان کے بارے میں رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ ''ان کو ایسی ایسی ظرافتیں بھی سوجھ جاتی ہیں جہاں بہ مشکل کسی کی رسائی ہوسکتی ہے۔'' بیان کی لطافت و شگفتگی اور خیال کی متانت کے ساتھ طنز نگاری ان کی تحریروں میں نمایاں ہے۔ ملا رموزی بھوپال کے طنز و مزاح نگاروں کے امام تسلیم کیے جاتے ہیں اور ملک گیر سطح پر بھی ان کی خدمات کا اعتراف کیے بغیر اردو طنز و مزاح کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

ملا رموزی پر یہ مونوگراف پروفیسر محمد نعمان خان نے تیار کیا ہے۔ وہ این سی ای آر ٹی دہلی میں پروفیسر تھے۔ ان کی سات کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں بھوپال ادب کے آئینے میں (1994)، بھوپال میں اردو ۔انضمام کے بعد (2006) مشاہیر اردو اور ریاست بھوپال (2010) اور کلیات ابراہیم یوسف (2015) شامل ہیں۔

ISBN 978-93-5160-105-0
9 789351 601050
NCPUL
New Delhi
₹ 80.00

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی ۔ 110025